ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۳۴

تیسرا سال: دسویں کتاب

اکتوبر ۲۰۰۵ء

مراسلت: ۵۴۵/c گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey_90@hotmail.com
ویب سائٹ: www.apwn.net/urdu
فون: ۰۶۱-۶۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶
مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سید عامر سہیل — ۳

ژاں پال سارتر: خصوصی مطالعہ (۱۰۰ویں سالگرہ کے موقع پر)

غلام حسین ساجد کی نظمیں:

ژاق دریدا سے ایک مکالمہ:

مضامین:

کہانی:

حروفِ زر:

۱۲۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۸۹

سید عامر سہیل

چند باتیں

طاہر عباس

منٹو: ماہ و سال کے آئینے میں (تحقیقی جائزہ)

سعادت حسن منٹو کی وفات ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء سے لے کر اب تک منٹو کی شخصیت اور فن پر شائع ہونے والی تحقیقی، تنقیدی اور سوانحی کتب کی تعداد کم و بیش تیس ہے۔ جن کا سہرا پاکستان اور ہندوستان کے مختلف ناقدین، محققین اور مرتبین کے سر ہے۔

سن ۲۰۰۵ء میں منٹو پر سب سے زیادہ کتابیں (پانچ) شائع ہوئیں۔ اس سے قبل منٹو پر کسی بھی سال اتنی تعداد میں کتابیں شائع نہیں ہوئیں۔ یہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سعادت حسن منٹو، ایک نئی تعبیر، از پروفیسر فتح محمد ملک، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۲۔ سعادت حسن منٹو، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، از ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۳۔ سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے، مرتبہ، احمد سلیم، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔
۴۔ سعادت حسن منٹو کی کہانی، از انیس ناگی، جمالیات، لاہور۔
۵۔ سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)، مرتبین، شمشیر حیدر شجر/نوید الحسن، شعبہ اردو، جی سی یو، لاہور۔

مندرجہ بالا کتب منٹو کی از سرِ نو تفہیم (جس کی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی ہے) میں کتنی معاون ثابت ہوئی ہیں اس بات کا جائزہ بھی کسی وقت پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو پر شائع ہونے والی اب تک کی آخری کتاب ''سعادت حسن پچاس برس بعد'' جسے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور نے منٹو کی پچاسویں برسی کی مناسبت سے شائع کیا ہے اور اسے شعبہ کے سال دوم کے طلباء شمشیر حیدر شجر اور نوید الحسن نے مرتب کیا ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں اسی کتاب میں شامل شمشیر حیدر شجر کے ایک مضمون ''سعادت حسن ماہ و سال کے آئینے میں'' کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔ جو کہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۱ تا ۲۹ پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلی بات جس کا ذکر کیے بغیر بات کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا اور وہ یہ کہ مذکورہ مضمون اوّل تا آخر چوری شدہ ہے۔ مصنف نے پورے مضمون میں کہیں بھی اس بات کی نشاندھی نہیں کی کہ انہوں نے منٹو کی شخصی اور فنی زندگی سے متعلق اتنی معلومات کہاں سے اخذ کیں۔

شمشیر حدر یر شجر کا یہ مضمون دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے کا عنوان ہے 'منٹو ماہ و صال کے آئینے میں'' اس میں منٹو کی پیدائش، اس کے خاندان کا شجرہ، شادی، اولاد، تعلیم، مقدمات، منٹو کی فلمیں، رہائش گاہیں، اولین تحریریں، ادبی و ثقافتی اداروں سے وابستگی، اخبارات و رسائل سے وابستگی، انتقال اور

یہاں تک کہ اُن کی مرقد پر کندہ کتبے تک کا سنین کے اعتبار سے مکمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ حصہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۱ تا ۱۵ پر مشتمل ہے۔ جبکہ مضمون کا دوسرا حصہ بعنوان ''منٹو کی تصنیفات کا اشاریہ'' صفحہ نمبر ۱۶ تک ۲۹ تک ہے۔

جہاں تک مضمون کے پہلے حصے کا تعلق ہے۔ یہ حرف بہ حرف ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے پی ایچ۔ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے، سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے سے چوری کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری کو پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے یہ مقالہ پیش کرنے پر ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی تھی۔ جبکہ مضمون کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے اس مقالے کے ساتھ ساتھ انیس ناگی کی کتاب ''سعادت حسن منٹو'' میں شامل سعادت حسن منٹو کے افسانوی مجموعوں کا کیٹلاگ اور منٹو کی کتابیں صفحہ نمبر ۱۰۸ تا ۱۱۵ سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب فیروز سنز لاہور نے ۱۹۸۷ء میں شائع کی۔ یہ بات ازخود تحقیق طلب ہے کہ جناب انیس ناگی نے اس کیٹلاگ کی ترتیب میں کون سا ذریعہ استعمال کیا۔ کیونکہ انہوں نے بھی شمشیر حیدر شجر کی طرح اپنے ماخذات کی نشاندھی نہیں کی۔ اب مضمون کے پہلے حصے ''منٹو ماہ و سال کے آئینے میں'' کے متن کا ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے مقالے کے ساتھ تقابلی جائزہ پیش خدمت ہے۔ شمشیر حیدر شجر لکھتے ہیں:

☆ نام: سعادت حسن، خاندانی نسبت: منٹو (کشمیری لال)

☆ قلمی نام: سعادت حسن منٹو

☆ دادا کا نام: خواجہ جمال الدین

☆ سوتیلی والدہ: جان مالی

☆ سوتیلی والدہ سے اولاد: ۱۔خواجہ محمد حسن ۲۔خواجہ سعید حسن ۳۔خواجہ سلیم حسن ۴۔امیر بیگم ۵۔بادشاہ بیگم ۶۔ماہتاب بیگم ۷۔سعیدہ بیگم ۸۔شاہ بیگم۔

☆ بہن بھائی: ۱۔اقبال بیگم ۲۔سعادت حسن منٹو ۳۔سکندرہ ۴۔محمود حسن

☆ اولاد: عارف (ولادت: ۳۰/اپریل ۱۹۴۰ء، وفات: ۲۸/اپریل ۱۹۴۱ء)

(سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد، ص ۱۱)

ڈاکٹر علی ثنا کے مقالہ سے چند اقتباسات دیکھئے:

''اصل نام سعادت حسن اور خاندانی نسبت سے منٹو کہلاتے تھے۔''

(سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۱)

''غلام حسن ۱۸۵۵ء میں پیدا ہوئے۔''

(سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۵)

''خواجہ جمال الدین سعادت حسن کے دادا ہیں۔''

(سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۴)

غلام حسن کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کا نام جان مالی تھا جبکہ دوسری کا نام سردار بیگم تھا۔ جان مالی کے بطن سے خواجہ غلام حسن کے ہاں تین بیٹے اور چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

بیٹے: ۱۔خواجہ الحاج محمد حسن بیرسٹریٹ لاء سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر جرنل
۲۔خواجہ سعید حسن بیرسٹریٹ لاء سابق وائس پرنسپل یونیورسٹی لاء کالج لاہور
۳۔خواجہ سلیم حسن (انجینئر)

بیٹاں: ۱۔امیر بیگم ۲۔بادشاہ بیگم ۳۔پادشاہ بیگم ۴۔مہتاب بیگم ۵۔سعیدہ بیگم ۶۔شاہ بیگم[۱]

سردار بیگم کے بطن سے خواجہ غلام حسن کے ہاں بہ ترتیب ذیل چار بچے پیدا ہوئے۔

۱۔اقبال بیگم ۲۔سعادت حسن منٹو ۳۔سکندرہ ۴۔محمود حسن

(سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۸-۹)

''۳۰/اپریل ۱۹۴۰ء کو منٹو کے ہاں لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس کی والدہ نے عارف رکھا تھا۔'' (سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۹۲)

''ان کا اکلوتا بیٹا عارف اچانک ۲۸/اپریل ۱۹۴۱ء کو فوت ہو گیا۔''[۲]

''منٹو کی بڑی بیٹی نگہت مورخہ ۹/جولائی ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں پیدا ہوئی۔''

''منٹو کی منجھلی بیٹی نزہت لاہور میں مورخہ ۶/فروری ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئیں۔''[۳]

''نصرت منٹو کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں لاہور میں ۷/نومبر ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئیں۔''

اب کتاب کا یہ صفحہ پلٹ کر اگلے صفحے یعنی صفحہ نمبر بارہ پر آتے ہیں۔ جہاں شمشیر حیدر شجر نے منٹو کی تعلیمی زندگی کا سال بہ سال خاکہ پیش کیا ہے۔

ابتدائی تعلیم تقریباً دس برس تک گھر میں حاصل کی۔

چہارم: گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر، ۱۹۲۲ء
پنجم: ایضاً ۱۹۲۳ء
ششم: ایضاً ۱۹۲۴ء
ہفتم: ایضاً ۱۹۲۵ء
ہشتم: ایضاً ۱۹۲۶ء
نہم: ایضاً ۱۹۲۷ء
میٹرک: ایضاً ۱۹۳۱ء
ایف اے (نامکمل) ایم او کالج امرتسر (سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد، ص ۱۲)

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مقالے سے اقتباس ملاحظہ ہو ''یونیورسٹی ریکارڈ، مصدقہ بیانات اور حقیقی کوائف کے مطابق منٹو کی ابتدائی تعلیمی زندگی کا گوشوارہ درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	سال	مدرسہ	شہر	جماعت	کیفیت
۱۔	۱۹۲۱ء	مسلم سکول (حصہ پرائمری) چوک فرید	امرتسر	چہارم	داخل ہوئے ۱۹۲۲ء میں پاس ہوئے
۲۔	۱۹۲۲ء	گورنمنٹ ہائی سکول بت وکٹوریہ	ایضاً	پنجم	داخل ہوئے
۳۔	۱۹۲۳ء	ایضاً	ایضاً	ششم	
۴۔	۱۹۲۴ء	ایضاً	ایضاً	ہفتم	
۵۔	۱۹۲۵ء	ایضاً	ایضاً	ہشتم	
۶۔	۱۹۲۶ء	ایضاً	ایضاً	نہم	
۷۔	۱۹۲۷ء	ایضاً	ایضاً	دہم	
۸۔	۱۹۲۸ء	ایضاً	ایضاً	میٹرک کا امتحان دیا فیل ہوئے۔	

(سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۲۲)

صفحہ نمبر ۱۲ اور ۱۳ پر موجود منٹو کی تحریر کردہ فلمیں ''سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے'' صفحہ نمبر ۱۰۹، ۱۱۵ اور ۱۲۹ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ منٹو کی رہائش گاہوں کے حوالے سے جو معلومات شمشیر حیدر شجر نے مہیا کیں وہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مقالے کے صفحات ۳۵، ۷۸، ۱۰۲، ۱۰۸، ۱۰۹ اور ۱۲۰ پر جوں کی توں درج ہیں۔ صرف دو مثالیں پیش ہیں:

بمبئی، ۱۲/اگست ۱۹۴۲ء لکشمی نیشن لاہور، ۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۵ء۔

(سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد، ص ۱۳)

علی ثنا بخاری یوں لکھتے ہیں:

''دہلی میں منٹو ابتداً حسبِ سابق مصور کے دفتر ۱۷/اڈیلفی چیمبرز کلیئر روڈ میں قیام پذیر ہوئے۔ بعد میں انہوں نے ۱۲/اگست ۱۹۴۲ء کو اپنے اہلِ خانہ کو بھی بلوالیا اور باہم میں رہنے لگے۔''[۴]

''حامد جلال ان دنوں ۳۱-لکشمی مینشن مال روڈ میں مقیم تھے۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں منٹو جب لاہور پہنچے تو اہل خاندان کے ہمراہ اس گھر میں رہائش پذیر ہوئے اور زیریں منزل میں منٹو بیوی بچوں کے ساتھ اپنے آخری وقت تک مقیم رہے۔''[۵]

یہ چند اقتباسات اس دعوے کی سچائی کے لیے کافی ہیں جو راقم نے مضمون کے آغاز میں کیا تھا۔ طوالت سے بچنے کے لیے اب صرف ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مقالہ کے اُن صفحات کے نمبر درج کرنے

پر التفا کروں گا جن سے شمشیر حیدر شجر نے استفادہ کیا۔ صفحہ بارہ پر ''اولین تحریریں'' کے عنوان سے دی گئی معلومات ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مقالہ کے صفحہ ۵۰، ۵۳، ۶۲، ۱۱۹ اور ۲۳۵ سے لی گئی ہیں۔ ص ۱۴ پر درج ''ادبی و ثقافتی اداروں سے وابستگی'' اور ''اخبارات و رسائل سے وابستگی'' کا گوشوارہ صفحہ ۷۸، ۸۷، ۹۸ اور ۱۱۷، ۶۱ اور صفحہ نمبر ۱۳۹ کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے۔ آخر میں دونوں کے مختصراً اقتباسات کے ساتھ بات کو ختم کرنے کی کوشش کرونگا۔

''وفات: بروز منگل ۱۸/جنوری ۱۹۵۵ء، نماز جنازہ، بروز منگل ۱۸/جنوری ۱۹۵۵ء، ساڑھے تین بجے، مرقد/ مدفن: قبرستان میانی صاحب، لاہور۔''

(سعادت حسن منٹو پچاس برس بعد، ص ۱۵)

علی ثناء بخاری لکھتے ہیں:

''ریڈیو اعلان کے مطابق ۱۸/جنوری ۱۹۵۵ء کو چار بجے سہ پہر سعادت حسن کا جنازہ اٹھایا جانا تھا۔ لیکن اُن کی مخصوص بیماری سے ہونے والی موت کے پیشِ نظر مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ بیشتر ساڑھے تین بجے جنازہ ۳۱-لکشمی مینشن سے اُٹھایا گیا۔ جنازہ مال روڈ سے گزر کر قبرستان میانی صاحب پہنچا جہاں سعادت حسن کو دفن کیا گیا ہے۔''

(سعادت حسن منٹو-سوانح و ادبی کارنامے، ص ۱۶۸)

جہاں تک مضمون کے دوسرے حصے ''منٹو کی تصانیف کا اشاریہ'' کا تعلق ہے تو اسے صاحب مضمون نے مندرجہ ذیل تین نسخوں کو سامنے رکھ کر ترتیب دیا ہے۔

۱۔ سعادت حسن منٹو، شخصیت اور ادبی کارنامے، از ڈاکٹر علی ثنا بخاری۔

۲۔ سعادت حسن منٹو، از انیس ناگی۔

۳۔ سعادت حسن منٹو، حیات اور کارنامے، از ڈاکٹر برج پریمی زیب پبلی کیشنز، سری نگر، ۱۹۸۶ء۔

مصنف نے اس اشاریے کو مرتب کرتے ہوئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس نے تینوں نسخے سامنے رکھ کر اور اسے جو مواد جہاں سے مکمل نظر آیا اسے اپنا لیا اور تینوں نسخوں کے درمیان پائے گئے اختلافات کو حواشی میں درج کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ شمشیر حیدر شجر نے محض ان اختلافات کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجوہات اور درست نسخے کی نشاندھی کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے اس کی نشاندھی نہیں کی۔ وہ ان اختلافات کی وجوہات بیان کر سکتے تھے۔ اگر انہوں نے منٹو کی تصنیفات کے تمام نسخ اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوتے۔ تین نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک فہرست بنا دیتا اور اُن کے اختلافات بیان کر دینا تقابلی جائزہ تو ہوسکتا ہے تحقیقی جائزہ ہرگز نہیں۔ انہوں نے بھی ان غلطیوں کو دہرایا جو انیس ناگی نے کی تھیں۔ یوں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس اشاریے کی ترتیب میں ان کے ماخذات کون کون سے تھے۔ اب مضمون

کے کچھ حصوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

''آتش پارے''، ''لذت سنگ''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''نمرود کی خدائی''، ''بادشاہت کا خاتمہ''، ''کروٹ'' اور ''گنجے فرشتے'' ایسے افسانوی مجموعے ہیں جن کی تفصیل ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے صفحہ ۱۹۱، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۶۲، ۳۲۹ پر دی ہے۔ شمشیر حیدر شجر نے ان کی تفصیل ص ۱۵ سے صفحہ ۲۹ تک دی ہے۔ جبکہ انیس ناگی کے ہاں ص ۱۰۸ تا ۱۱۵ تک ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام افسانوی مجموعوں کے پبلشرز، سنِ اشاعت اور افسانوں کی ترتیب و تعداد تینوں کے ہاں ایک جیسی ہے۔ چونکہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے یہ فہرست زمانی اعتبار سے سب سے پہلے مرتب کی تھی لہٰذا یہ قیاسی درست معلوم ہوتا ہے کہ انیس ناگی اور شمشیر حیدر شجر دونوں کا ماخذ ان افسانوی مجموعوں کی حد تک ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا مقالہ ہی ہے۔

ذیل میں چند ایسے افسانوی مجموعوں کی تفصیل دی جاتی ہے جنہیں مصنف نے علی ثنا بخاری کے ساتھ ساتھ انیس ناگی کی کتاب سے اُٹھایا ہے۔ کیونکہ ان میں سے بعض مجموعوں میں انیس ناگی سے سرزد ہونے والی غلطیوں کو جوں کا توں دُہرایا گیا ہے۔ اس تقابل سے ان کے ماخذات کی نشاندھی مقصود ہے۔

دھواں

علی ثنا بخاری اپنے مقالہ کے صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں:

''منٹو کے افسانوں کا مجموعہ دھواں محبوب المطابع دہلی میں طبع ہو کر ساقی بک ڈپو دہلی سے ۱۹۴۱ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔''

(سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۲۰۰)

شمشیر حیدر شجر نے یہی بات اختصار کے ساتھ یوں پیش کی ہے:

''دُھواں، ساقی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۱ء''

(سعادت حسن منٹو، پچاس برس بعد، ص ۱۸)

البتہ ڈاکٹر انیس ناگی نے سنِ اشاعت ۱۹۳۸ء بتایا ہے جو غلط ہے۔ جہاں تک افسانوں کی تعداد کا تعلق ہے وہ تینوں کے ہاں برابر ہے۔ لیکن ان تینوں کے ہاں ان افسانوں کی ترتیب مختلف ہے۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری نے تمام افسانوں کے ساتھ ان کے صفحہ نمبر بھی درج کیے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی ایڈیشن کے افسانوں کی ترتیب مختلف ہو۔ میرے پاس ڈاکٹر برج پریمی کی تصنیف ''سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے'' موجود نہیں۔ قیاس ہے کہ شمشیر حیدر شجر نے یہ فہرست اسی کتاب میں سے لی ہے۔

بغیر اجازت

شمشیر حیدر شجر، ص ۲۵ نے یہاں انیس ناگی کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر علی ثناء بخاری، ص ۲۳۲ پر اس مجموعے کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۵ء بتاتے ہیں، جبکہ انیس ناگی اور شمشیر حیدر نے اس کتاب کا سنِ اشاعت ۱۹۵۰ء درج کیا ہے۔ افسانوں کی تعداد اور ترتیب تینوں کے ہاں یکساں ہے۔

برقعے

داخلی شہادت سے اس مجموعے کا ماخذ بھی انیس ناگی کی کتاب ہی ٹھہرتی ہے۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے مقالہ کے صفحے ۳۲-۲۳۳ کے مطابق برقعے میں شامل افسانوں کی تعداد گیارہ ہے۔ جبکہ انیس ناگی اور شمشیر حیدر، ص ۲۵ پر ایک ہی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ دونوں ''ایک بھائی، ایک واعظ'' کو الگ الگ افسانے کے طور پر درج کیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک ہی افسانہ ہے۔ چونکہ شمشیر حیدر شجر نے افسانوی مجموعہ سے فہرست بنانے کی بجائے صرف بنی بنائی فہرستوں پر اکتفا کیا ہے۔ اس لیے وہ مکھی پر مکھی مارتے چلے گئے۔ یہی غلطی کے ماخذ کی نشاندھی کرتی ہے۔ اس طرح ایک اور غلطی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ انیس ناگی نے منٹو کے ایک افسانے کا نام ''معراج دین'' لکھا ہے۔ اصل میں یہ افسانہ ''موج دین'' ہے۔ شمشیر حیدر شجر نے اسے ''معراج دین'' لکھا ہے۔ یہیں سے ان کے اصل ماخذ کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

شیطان

ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے مطابق:

''شیطان کے عنوان سے منٹو کی تخلیقات کا ایک مجموعہ اپریل ۱۹۵۵ء میں منٹو کی وفات کے بعد نیو تاج آفس دہلی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی تمام تحریریں اس سے پہلے شائع ہو چکی تھیں۔''

(سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے، ص ۲۳۳)

ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مقالے میں اس مجموعے سے متعلق صرف یہی معلومات دستیاب ہو سکی ہیں۔ دوسری طرف انیس ناگی نے اپنی کتاب میں اس مجموعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ چنانچہ شمشیر حیدر شجر بھی اس کے متعلق صرف اتنا لکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ شیطان، تاج آفس دہلی، ۱۹۵۵ء (سعادت حسن منٹو، پچاس برس بعد، ص ۲۵)۔

ظاہر ہے افسانوی مجموعے کے بجائے علی ثنا بخاری کے مقالہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ محض چند مثالیں تھیں۔ جو محض اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لیے پیش کی گئیں۔ اگر شمشیر حیدر شجر مضمون کے آخر میں اپنے ماخذات کی نشاندھی کر دیتے تو اس نے ان کی عزت میں کمی واقع نہ ہوتی۔ جہاں یہ

سوال اہمیت کا حامل ہے کہ مصنف نے اپنے ماخذات کی نشاندھی کیوں نہ کی وہاں اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ ادارے کے سربراہ جناب ڈاکٹر سہیل احمد خان نے مضمون کو جوں کا توں شائع کرنے کی اجازت کیوں کر دی دے۔ کیا وہ نہیں سمجھے تھے کہ یہ ایک تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے اور تحقیق کے لیے قدم قدم پر حوالوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مضمون اگر کسی معمولی اخبار یا رسالے میں شائع ہوتا تو شاید بات آئی گئی ہو جاتی لیکن گورنمنٹ کالج یونیورسٹی جیسے ادبی روایت کے علمبردار ادارے کی طرف سے شائع ہونے والی اس کتاب میں شائع ہونے کی وجہ سے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

حواشی وتعلیقات

۱۔ ڈاکٹر علی ثناء بخاری نے سعادت حسن منٹو کی بڑی بہن ناصرہ اقبال سے لیے گئے انٹرویو مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۸۳ء کے ذریعے یہ معلومات حاصل کیں۔

۲۔ عارف کی پیدائش ووفات سے متعلق ڈاکٹر علی ثناء بخاری، ص ۹۲ کے حواشی میں لکھتے ہیں: قبل ازیں، کسی نے بھی حتمی طور پر منٹو کے بیٹے کی تاریخ پیدائش کا تعین نہیں کیا۔ لیزلی فلیمنگ نے اپنے مقالے (ص، ۳۱) میں احمد ندیم قاسمی کے نام منٹو کے ایک خط (منٹو کے خطوط، ص ۱۱۷) کے حوالہ سے لکھا ہے:

"He and Sofia became the parents of a son, Arif, in May, 1940."

جبکہ اس خط میں، منٹو نے قاسمی کو صرف یہ لکھا ہے۔ اس سے قبل آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں، جس میں مَیں نے آپ کو لڑکے کی پیدائش سے مطلع کیا تھا۔ اس خط کے حاشیہ پر مرتب (احمد ندیم قاسمی) کا خود نوشتہ یہ نوٹ رقم ہے: ''مرتب کو یہ خط تلاش بسیار کے باوجود نہیں ملا۔ اس میں منٹو نے اپنے پہلے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دی تھی۔'' (منٹو کے خطوط، ص ۱۱۷)

مذکورہ بالا نوٹ اور خود منٹو کی تحریر سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عارف مئی ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ حتی کہ اس خط پر بھی کسی تاریخ کا اندراج موجود نہیں۔ صرف مئی ۱۹۴۰ء لکھا ہوا ہے۔ صحیح صورتِ حال کے تعین کے لیے محترمہ ناصرہ اقبال نے رہنمائی حاصل کی گئی۔ انہوں نے انٹرویو کے دوران کہا کہ ان کی بیٹی فریدہ، ۱۲ر اگست ۱۹۳۹ء کو پیدا ہوئی تھی اور فریدہ کی ولادت کے پورے دس ماہ بعد بمبئی ۱۱ر جون ۱۹۴۰ء کو اُن کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔

والدہ کے انتقال کے دن عارف بیالیس روز کا تھا (ذاتی انٹرویو، لاہور: ۱۱-۱۳-۱۹۸۳ء) اس لحاظ سے عارف کی ولادت کسی حتمی تاریخ ۳۰ر اپریل ۱۹۴۰ء طے پاتی ہے۔

۳۔ ذاتی انٹرویو، ناصرہ اقبال، ۱۳ر نومبر ۱۹۸۳ء۔

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

ڈاکٹر علی ثنا بخاری

منٹو کے طرفدار

۲۰ر مئی ۲۰۰۱ء کو سعادت حسن منٹو کے حوالے سے حلقۂ اربابِ ذوق نے احمد ندیم قاسمی کی زیرِ صدارت، میوزیم آڈیٹوریم لاہور، میں ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا تھا جس میں نے اپنا مضمون ''منٹو کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ مضمون حلقۂ اربابِ ذوق کے کتابی سلسلے ''نئی تحریریں'' میں شائع کر دیا گیا۔ بعد میں یہی مضمون ہیئت اصلی میں ''انگارے'' کے منٹو نمبر میں شامل کیا گیا۔ اس مضمون میں، منٹو کی بابت جہاں بہت سی دیگر غلط فہمیوں کا اِزالہ کیا گیا، وہاں بالخصوص ایک واقعہ کو عقلی اور قانونی دلائل سے ردّ کر دیا گیا۔ وضاحت کے لیے اپنے مضمون کا یہ حصہ میں یہاں نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

> ''یہ ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے: کافی سردی تھی۔ ہم کلاس روم سے نکل کر گورنمنٹ کالج لاہور کے اوپن ایئر تھیٹر کی سیڑھیوں پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ اردو اختیاری کا پیریڈ دو بجے شروع ہوتا تھا، اُس دن جی ایم اثر کا پیریڈ تھا۔ وہ کلاس کے بارے میں زیادہ باقاعدہ نہیں تھے۔۔۔۔ اُس دن سردی زیادہ تھی اور جی ایم اثر اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور ایک دم کہا: منٹو صاحب آ رہے ہیں۔۔۔ منٹو کو دیکھتے ہی میں اُن کی طرف بھاگا گیا، سلام کیا، اُس نے تیز تر لہجے میں پوچھا ''اثر کھتے اے؟'' چلئے، میں اس کے ساتھ جی ایم اثر کے کمرے تک گیا، وہ اندر چلا گیا میں باہر منتظر رہا، منٹو جی ایم اثر سے وہسکی کے لیے پیسے مانگ رہا تھا، جو غالباً اُسے نہیں ملے تھے۔۔۔''[۱]

یہ تحریر انیس ناگی کی ہے۔ اس میں تین دعوے قابلِ غور ہیں۔ پہلا یہ کہ واقعہ ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء، دوپہر ۲ بجے کا ہے، دوسرا یہ کہ ''(منٹو) اندر چلا گیا، میں باہر منتظر رہا'' اور تیسرا یہ کہ ''منٹو جی ایم اثر سے وہسکی کے لیے پیسے مانگ رہا تھا جو غالباً اُسے نہیں ملے تھے۔''

انیس ناگی نے یہ تحریر ۱۹۸۴ء میں قلم بند کی تھی۔ میرے خیال میں تب اُنہیں قانونِ شہادت پڑھتے اور اِسے برتتے (apply) کرتے، کم وبیش بیس سال گزر چکے تھے۔ اسے کے باوجود بھی وہ کمرے کے باہر ''منتظر'' منٹو کو

جی ایم اثر سے پیسے مانگتے اور وہ بھی وہسکی کے لیے سن اور دیکھ رہے تھے۔ باہر کھڑے کھڑے اُنہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ پیسے ''غالباً اُسے نہیں ملے تھے۔''

دُکھ کی بات ہے کہ زورِ قلم نے اُنہیں یہ سوچنے کا موقع بھی نہ دیا کہ جس روز کے دو بجے دوپہر، وہ منٹو کو پیسے منگوا رہے تھے، اُس روز کی صبح ساڑھے دس بجے سعادت حسن ___ صفیہ، نگہت، نُزہت اور نصرت کے علاوہ بے چارمنٹو کو تنہا چھوڑ کر دائمی ملک عدم ہو چکے تھے۔[۲]

جلسہ گاہ میں انیس ناگی بھی موجود تھے۔ مجھے اطمینان نصیب ہوا کہ یہ بے بنیاد غلط فہمی بھی ختم ہوئی۔ حال ہی میں شعبۂ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور نے سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد) کے نام سے کتاب شائع کی ہے۔ اس کتاب میں انیس ناگی کی تحریر بعنوان ''گورنمنٹ کالج لاہور میں منٹو کا آخری دن'' جو ڈیڑھ صفحے پر مشتمل ہے بھی شامل کی گئی ہے۔ تحریر کا آغاز تقریباً وہی ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ البتہ تاریخ تبدیل کر دی گئی ہے:

''یہ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے۔ صبح کافی سردی تھی۔۔۔ ''اثر کتھے اے''۔[۳]

منٹو کی زبان سے کہلائے گئے الفاظ ''اثر کتھے اے'' کے بعد اِس نام نہاد واقعے کو تبدیل کر دیا گیا ہے۔ میں نے دونوں تحریروں کو دیکھا۔ پہلی نظر میں سمجھا شاید لکھنے والا دونوں تحریروں میں ۱۷ر جنوری اور ۱۸ر جنوری کے دو الگ الگ اوقات کا ذکر کر رہا ہے۔ پھر خیال آیا کہ اُس زمانے میں گورنمنٹ کالج، لاہور کسی مہاجن کی دوکان نہیں تھا، جہاں بلا ناغہ منٹو اُدھال لینے آ جایا کرتے تھے۔ ویسے بھی ۱۸ر جنوری ۱۹۵۵ء کی دوپہر کو سعادت حسن منٹو کو نہ پیسوں کی ضرورت رہی تھی اور نہ شراب کی، اس لیے یہ سوچتے ہوئے کہ شاید لکھنے والے نے اک بے بنیاد واقعہ کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے صرف تاریخ تبدیل کر کے اک مزید کاوش کی ہو، دونوں تحریروں کا بنظرِ غائر مشاہدہ کیا۔ پہلی تحریر میں ''۔۔۔ منٹو، جی ایم اثر سے وہسکی کے لیے پیسے مانگ رہا تھا، جو غالباً اُسے نہیں ملے تھے'' کے بعد کی روداد یوں رقم کی گئی ہے:

''۔۔۔ جو غالباً اُسے نہیں ملے تھے، وہ جلدی سے باہر نکلا، میں کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اُس کے ساتھ ہو گیا کہ کالج گیٹ تک چھوڑ آؤں، منٹو خاموش تھا، بس اتنا پوچھا: ''کرامت حسین جعفری کتھے اے؟'' میں نے کالج کے گیٹ پر کھڑے ہو کر سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ کی طرف اشارہ کیا، سلام کیا اور منٹو اُس طرف جانے لگا۔''[۴]

شاید یہ سمجھتے ہوئے کہ ''کالج کے گیٹ پر کھڑے ہو کر سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ کی طرف اشارہ'' کر دینے سے منٹو کی طرفداری کا حق صحیح طور پر ادا کرنے میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے، موجودہ تحریر میں اِس خود ساختہ کہانی کو یوں آگے بڑھانے کی ناروا کوشش کی گئی ہے:

''۔۔۔ کچھ دیر بعد منٹو غصے میں باہر نکلے اور (جی ایم اثر کے) کمرے کا دروازہ پٹخ دیا۔ غصے میں پوچھا:

''کرامت حسین جعفری کتھے اے؟''

''وہ تو سائیکلوجی ڈیپارٹمنٹ میں ہوتے ہیں اور یہ شعبہ کالج سے باہر سڑک کے اُس پار ہے۔''

''میرے ساتھ چلو''

راستے میں مَیں نے منٹو سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہے تھے۔ سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کے ایک بوسیدہ سے کمرے میں کرامت حسین جعفری لیکچر دے رہے تھے۔ منٹو نے دروازے میں کھڑے ہو کر بڑے تحکم سے کہا ''کرامت!!''

کرامت حسین جعفری نے منٹو کو دیکھا، ایک دم سے باہر نکل آئے، میں برآمدے میں ایک طرف چلا گیا۔ منٹو اور کرامت حسین جعفری آپس میں کچھ دیر کے لیے باتیں کرتے رہے۔ کرامت حسین جعفری نے منٹو کو بیس روپے دیے۔

میں اور منٹو برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر باہر سڑک کو پر کھڑے ہو گئے۔ منٹو نے بے تابی میں کہا ''کا کا میرا کم ہو گیا۔ میں چلاں۔''[۵]

تذکرہ بالا دونوں تحریروں کا مُتناقض بالذات ہونا اِس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مبینہ واقعہ بُہتان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اِن میں درج جزئیات سے بحث اگرچہ غیر ضروری ہو جاتی ہے لیکن یہ واضح کر دینا پھر بھی ضروری ہے کہ کرامت حسین جعفری اور سعادت حسن منٹو میں اُستاد اور شاگرد کا رشتہ تھا۔[۶] ظاہر ہے شاگرد اُستاد کو تحکمانہ انداز میں نہیں بلا سکتا۔ ایسا اگر نہ بھی ہو تو بھی مانگنے والا پیسے دینے والے کو، تحکمانہ لہجے میں کیوں کر بلا سکتا ہے؟ اور وہ بھی پیسے لینے سے قبل۔

مزاج کے اعتبار سے منٹو ویسے میں ''کا کے'' کو اپنا راز دان نہیں بنا سکتا تھے۔ لیکن لکھنے والے نے ''کا کا میرا کم ہو گیا۔ میں چلاں'' تک بھی اکتفا نہیں کیا بلکہ داستان کو زیب دینے کی کوشش میں یہاں تک پہنچے:

''منٹو نے اِن پیسوں کا کیا کیا؟ اس کا علم اگلے دن کالج میں اخبار کی خبر سے ہوا کہ منٹو انتقال کر گئے ہیں۔ ان کا جگر پھٹ گیا تھا۔''[۷]

تحریر کے یہ آخری تین فقرے بھی لکھنے والے کی ذہنی کیفیات کے غماز ہیں۔ آغاز میں لکھتے ہیں ''یہ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے'' انجام میں لکھتے ہیں ''اس کا علم اگلے دن کالج میں اخبار کی خبر سے

ہوا کہ منٹو انتقال کر گئے ہیں۔'' گویا ۱۸؍جنوری کے اخبار میں ہی منٹو کے انتقال کی خبر چھپ گئی تھی حالانکہ ۱۸؍جنوری کو ساڑھے دس بجے صبح اُن کا انتقال ہوا اور یہ خبر ۱۹؍جنوری کے اخبارات[۸] میں شائع ہوئی تھی۔ ''منٹو نے اِن پیسوں کا کیا کیا؟'' اِس کا علم لکھنے والے کو کس ذریعے سے ہوا؟ یہ راز اُن کے علاوہ کوئی دوسرا جان ہی نہیں سکتا۔ ''اُن کا جگر پھٹ گیا تھا۔'' منٹو کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوا تھا۔ کسی طبی ماہر نے یہ رپورٹ نہیں دی تھی اور نہ ہی کسی بھی اخبار نے یہ کچھ لکھا جو صاحبِ تحریر نے لکھا ہے۔

زیرِ نظر تحریر کو کتاب[۹] میں ''مضامین و مقالات'' کے باب میں جگہ دی گئی ہے۔ حالانکہ اس کا سرسری مطالعہ ہی واضح کر دیتا ہے کہ یہ نہ تو ادبی یا تنقیدی مضمون ہے اور نہ ہی تحقیقی مقالہ۔ صرف اک خود ساختہ ''واقعہ'' ہے۔ اخلاقیات، اُصول و ضوابط اور قوانین اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ ایسے واقعات شائع کرنے سے قبل اُن کی صحت کی تصدیق کر لی جائے۔ کتاب کا آغاز ''پیش لفظ'' سے کیا گیا ہے۔ ''پیش لفظ'' کا اختتام اِس فقرے پہ ہوتا ہے:

> ''مرتبین جی۔سی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر خالد آفتاب کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے اِس منصوبے کی ہر سطح پر حوصلہ افزائی اور کتاب کی اشاعت کے لیے وسائل مہیا کیے۔''

اور آخر میں لکھنے والے کا نام اور پتہ یوں درج کیا گیا ہے۔

سہیل احمد خان
صدر شعبۂ اردو
جی سی یونیورسٹ، لاہور

ظاہر ہے ''پیش لفظ'' لکھنے والے نے کتاب کے مندرجات پڑھے بغیر پیش لفظ نہیں لکھا۔ کتاب کے مندرجات میں تحریر زیرِ بحث بھی شامل ہے۔ سہیل احمد خان اُس کتاب[۱۰] سے بھی ناواقف نہیں جس میں پہلی تحریر[۱۱] درج ہے۔ اس لیے کہ اُس کتاب کی تقریب رونمائی میں نہ صرف وہ شریک تھے اور سامعین میں میرے ساتھ بیٹھے تھے بلکہ انہوں نے اُس کتاب پہ باقاعدہ تقریر بھی کی تھی۔ یہاں تک کہ تقریر کے دوران میں بھی یہ کتاب اُن کے پیشِ نظر تھی، جسے جاتے وقت، اِس امر کے ماوجود کہ صاحبِ کتاب مجھے بھی وہ کتاب دے چکے تھے، یہ کہہ کر مجھے تھما گئے تھے کہ شاید یہ میرے کام آ سکے۔ کتاب کا وہی نسخہ آج میرے بھی سامنے ہے، جس کے پہلے ورق پہ رقم ہے:

جناب سہیل احمد خان کے لیے
انیس ناگی
۲۲/۱۱/۸۴

سعادت حسن منٹو ساری عمر ذہنی اور جسمانی اذیتوں کا شکار رہے۔ آج جبکہ اُنہیں اِسے دنیا کو

چھوڑے ہوئے بھی پچاس برس بیت چکے ہیں، اُن کے طرفدار، اُن کی روح کو زخمی کرنے کی جہدِ مسلسل میں مصروف ہیں۔ خوف بھی ہے اور خدشہ بھی کہ متذکرہ تحریروں کے موجد اور اُن کے ہم مشرب ایسی ہی TRASH لکھتے رہیں گے جو اُن کے ہم صفیر شائع بھی کرتے رہیں گے ___ اردو، ادب، بالخصوص افسانہ اور منٹو کے محققین اور طالب علموں کے لیے یہ لمحہ فکر ہے!

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سعادت حسن منٹو، مکتبہ جمالیات، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۳۱، ۳۲۔
۲۔ انگارے (منٹو نمبر)، ملتان، جنوری ۲۰۰۵ء، ص ۲۱، ۲۲۔
۳۔ سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۵۵۔
۴۔ سعادت حسن منٹو، مکتبہ جمالیات، لاہور، ص ۳۲۔
۵۔ سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)، ص ۵۶۔
۶۔ سعادت حسن منٹو، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (پنجاب یونیورسٹی) ۱۹۸۴ء، ص ۳۰۔
۷۔ سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)، ص ۵۶۔
۸۔ (الف) روزنامہ ''احسان''، ۱۹؍جنوری ۱۹۵۵ء۔
(ب) سول اینڈ ملٹری گزٹ، ۱۹؍جنوری ۱۹۵۵ء۔
۹۔ سعادت حسن منٹو (پچاس سال بعد)، ص ۵۳۔
۱۰۔ سعادت حسن منٹو، مکتبۂ جمالیات، لاہور، ۱۹۸۴ء۔
۱۱۔ ایضاً ص ۳۱، ۳۲۔

قاضی حبیب الرحمٰن

ہر آن کسی نشے میں سرشار پرندے
لگتے ہیں مجھے اپنے ہی اشعار پرندے

اب تک جو ہواؤں کا تسلسل نہیں ٹوٹا
اُترے تھے مرے صحن میں اک بار پرندے

میلہ سا لگا رہتا ہے شب بھر مرے دل میں
اک جائے تو آجاتے ہیں دو چار پرندے

لگتا ہے کوئی شہرِ طلسمات کا عالم
بیٹھے ہوئے دیوار بہ دیوار پرندے

یکسو ہیں کچھ ایسے کہ فراغت نہیں یکسر
ہر سو نظر آتے ہیں جو بیکار پرندے

کیا نشہ آوارگیِ موجِ ہوا ہے
رکھتے نہیں خود سے بھی سروکار پرندے

آتے ہیں مگر روز ، کسی شہرِ سبا سے
یہ دل پر اُترتے ہوئے اخبار پرندے

ہوتی ہے طلوع ایک نئی شان سے ، ہر صبح
دامن میں لیے سینکڑوں گلکار پرندے

بس آنکھ جھپکتے ہی بنا دیتے ہیں کیا کیا
افلاک پہ اُڑتے ہوئے گلزار پرندے

یہ میری تمناؤں کی تمثیل ہے گویا
خوش رنگ ،خوش آہنگ ،خوش اطوار پرندے

اسلام ہی اسلام ، محبت ہی محبت
فطرت کا ہے بے ساختہ اظہار پرندے

چہرے کے تاثر میں ملاوٹ نہیں کرتے
ہر آئنہ ہیں ، آئنہ اقدار پرندے

اِس صورتِ حالات کا سوبار ، لبرا ہو
کیا دن تھے کہ جب اپنے تھے، ہر بار پرندے

مَت پوچھ ، کہ سنسان ہے کیوں صحنِ گلستاں
یہ دیکھ ، کہ ہیں رونقِ بازار پرندے

چھائی ہے کچھ افسردگی و بے دلی ایسی
اقرار ہی کرتے ہیں نہ انکار پرندے

پھرتے ہیں اب آنکھوں میں چھپائے ہوئے اشجار
رقصاں تھے کبھی جو سرِ اشجار پرندے

بے وجہ نہیں، اپنی پریشانی خاطر
دیکھے ہیں کہیں آج گرفتار پرندے

کیا آتی ہے جی میں کہ کسی صبح ، اچانک
اُڑ جاتے ہیں سب چھوڑ کے گھر بار پرندے

یہ دن بھی لکھے تھے مری قسمت میں کہ دیکھوں
سوچوں سے گراں بار ، سبکسار پرندے

کیا جانیے، کس عہد میں پرواز کناں ہیں
بیٹھے ہیں جو چپ چاپ، سرِ دار پرندے

اجوں بادِ صبا خود سے گزر جاتے ہیں اِک دم
نادیدہ جہانوں کے ہوادار پرندے

اک ضعف کی طاقت ہے کہ رکھتے ہیں رسائی
اِس وقت کی دیوار کے اُس پار پرندے

کیا عالمِ حیرت ہے کہ سب دیکھ رہے ہیں
آپس میں ، سرِ قافؔ ، پُر اسرار پرندے

دل بن کے دھڑکتا ہے جو اک درد سا شب بھر
رکھتے ہیں، غضت دولت بیدار پرندے

ہر روپ میں سو طرح کا سامانِ تماشا!
دیکھے ہیں کچھ ایسے بھی طرح دار پرندے

صدیوں کے تحیر میں گندھا ، ذوق تجسس
اک حال میں رہتے نہیں فکار پرندے

اک خواب کی تعبیر کو درکار ہیں، اِمشب
مہتاب ، ہوا ، ابر ، چمن زار ، پرندے

وہ کوئی بھی موسم ہو ، ٹھہرتے نہیں دم بھر
اک ساعتِ لرزاں سے خبردار پرندے

ہر سر میں حبیبؔ ، ایک ہوا گونج رہی ہے
ہر رنگ میں اُڑنے کو ہیں تیار پرندے

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

اک یقین - ہر گماں میں رہتا ہے
سود کیا کیا - زیاں میں رہتا ہے

گلِ شاداب موسمِ امکاں
شاخِ خشکِ خزاں میں رہتا ہے

اک طرح دیکھیے - تو ہر امروز
اک نئے پاستاں میں رہتا ہے

ایک آہنگِ کائنات افزا
رقصِ آوارگاں میں رہتا ہے

سب مناظر سے اک جدا منظر
چشمِ بے خانماں میں رہتا ہے

دولتِ دل کی وسعتیں - مت پوچھ
درد - سارے جہاں میں رہتا ہے

فرصتِ کشمکش - غنیمت جان!
تیر - جب تک کماں میں رہتا ہے

دھوپ دیتی ہے کب ، کسی کا اماں
سایہ بھی سایباں میں رہتا ہے

ایک صورت پہ کیا ٹھہرتے - ہم
دل جو سیلِ زماں میں رہتا ہے

رَ بہ رَم - قطرہ قطرہ ، بحرِ وجود
ورطۂ امتحاں میں رہتا ہے

اپنے ہی تیر کا ہدف ہیں - سب
کون ، کس کی اماں میں رہتا ہے

اب تو جیسے بس ایک سایہ سا
شہر کے ہر مکاں میں رہتا ہے

کیسی منزل - کہ شوقِ آوارہ
پردۂ بادباں میں رہتا ہے

رات دن - جیسے اک بگولا سا
کوششِ رایگاں میں رہتا ہے

صورتِ مرگ - لمحۂ تخلیق
عرصۂ نا گہاں میں رہتا ہے

کیا خبر - اِن دنوں وہ سیارہ
کون سے آسماں میں رہتا ہے

سنتے ہیں - آج کل دلِ ناداں
سینۂ - راز داں میں رہتا ہے

اُمڈے پڑتے ہیں سب زمانے اِدھر
کیا ہنر - اِس جواں میں رہتا ہے

نسل در نسل - اک یہی کردار
ہر نئی داستاں میں رہتا ہے

اک زمانہ ہوا - مگر اب بھی
نشۂ جسم - جاں میں رہتا ہے

ہائے - وہ بعدِ قرب کا عالم!
آئنہ - درمیاں میں رہتا ہے

کچھ تو ہوتی ہے بات بھی ٹیڑھی
پیچ بھی کچھ زباں میں رہتا ہے

ہم ہی کچھ کم طلب تھے ورنہ حبیب
وہ - اِسی خاکداں میں رہتا ہے

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

خیالِ جلوۂ شیریں - جنوں تماشا ہے
حدیثِ کوہکن و بے ستوں ، تماشا ہے

نہ پوچھ - عالمِ سیرِ بہار گلبدناں
بساطِ چشمِ طلب سے فزوں تماشا ہے

نیاز مندیِ اربابِ ناز - کیا کہیے!
کلاہِ کج ، نگہ سرنگوں ، تماشا ہے

زہے نصیب ! کہ زنجیرِ پا ہوئی گردش
یہ اضطراب ہی گویا - سکوں تماشا ہے

فشارِ غم نے رگِ زیست سے کیا ہے کشید
بچشمِ کم نگہاں ، اشکِ خوں ، تماشا ہے

کچھ اور پھیل گئے دشتِ آگہی کے سراب
ہوائے نشۂ دانش - فسوں تماشا ہے

بس اک سوال کی دہشت سے گنگ ہیں افلاک
جواب میں ، نہ کوئی ہاں نہ ہوں ، تماشا ہے

کسی ہوا کا اُٹھایا ہوا ہے گرد و غبار
کہاں کے ارض وسما - سب دروں تماشا ہے

بدلتے جاتے ہیں ہر لحظ - صورت و معنی
یہ میرے دیدہ و دل - کیا کہوں ، تماشا ہے

سمجھ میں آتا ہے لیکن نظر میں آتا نہیں
مگر یہ عالمِ جاں - واژگوں تماشا ہے

مَبیں کہ بر دلِ مسکینِ ماچہ می گزرد
بیس کہ آں نگہ ذوفنوں ، تماشا ہے

نہیں کہ اہلِ ہوس، اوجِ دار تک پہنچے
سکوتِ اہلِ ہنر - ہاں، زبوں تماشا ہے

بہار ، نغمہ سرا ہے خزاں کے پردے میں
دلِ شکستہ ، حبیب! ارغنوں تماشا ہے

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

رات بھر - انتظار میں گزری
کچھ خزاں ، کچھ بہار میں گزری

اُڑتے رنگوں کو دیکھتے رہنا!
بس اِسی کاروبار میں گزری

اک دیا - اور اَن گنت سائے
اک پر ہول غار میں گزری

کسی بھٹکے ہوئے کرے کی طرح
گردشِ بے مدار میں گزری

اپنی مرضی سے کیا بسر کرتے
آگہی کے فشار میں گزری

کاش - کوئی نظر کشا منظر!
وہم پر اعتبار میں گزری

عمر بھر کی تلافیِ مافات
لمحہ بھر - اختیار میں گزری

لے اُڑی دفعتاً - ہوا کوئی
اور عجائب دِیار میں گزری

دیکھتا کیا ہوں - ایک موجِ شباب
بال کھولے - قطار میں گزری

گمرہی - راستہ بتاتے ہوئے
چاندنی کے غبار میں گزری

اک چمن - روح میں اُترتا ہوا
اک بدن کے حصار میں گزری

رنگ سے گھل گئے فضاؤں میں
برق سی تار تار میں گزری

ہوش والے - حواس کھو بیٹھے
جانے کیا اضطرار میں گزری!

اک تو تھا نشۂ وجود ، غضب
دوسرے پھر خمار میں گزری

وہ جو تھی مہلتِ نفس دو نفس
سو بھی خود سے فرار میں گزری

اپنے ہاتھوں لُٹا کے نقدِ حیات
ایک اک سانس ، اُدھار میں گزری

خود سے کٹ کر بھی ایسا اطمینان
جیسے ، اپنے کنار میں گزری

فرصتِ کاروبارِ دیدہ وری
کرچیوں کے شمار میں گزری

منزلِ جاں کی جستجو میں حبیبؔ
زندگی - رہ گزار میں گزری

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

جام و مینا کے یار ہیں ہم لوگ
اَزَلی ب وہ خوار ہیں ہم لوگ

ہر نظر - تازہ موسموں کے نقیب
ہر نفس - تازہ کار ہیں ہم لوگ

تیری صورت کو شعر میں ڈھالا
کتنے رنگیں نگار ہیں ہم لوگ

وصل کی رات ، تم سے روشن ہے
شامِ غم کا نکھار ہیں ہم لوگ

کل طبیعت ذرا سی سنبھلی تھی
آج پھر بے قرار ہیں ہم لوگ

زندگی - سلسلہ ہواؤں کا
اے مگر - خاکسار ہیں ہم لوگ

ہر زماں - اَن گنت زمانوں سے
ہائے - کیا کیا دو چار ہیں ہم لوگ

ایک دریا کی تشنگی لے کر
ایک دریا کے پار ہیں ہم لوگ

جا بجا ٹوٹے آئنے کی طرح
جا بجا ، عکس بار ہیں ہم لوگ

تو بھی کچھ فہم میں نہیں آتے
حرف حرف آشکار ہیں ہم لوگ

تنگ ہے دل پہ جامہ ہستی
کس قدر بے شمار ہیں ہم لوگ

ڈوبتے جا رہے ہیں ارض و سما
کس تمنا کا بار ہیں ہم لوگ

دَم بہ دَم اُڑ رہا ہے رنگِ ہوا
آگہی کی بہار ہیں ہم لوگ

ہاں ، یہ دل بے غرض نہیں - یعنی
قابلِ اعتبار ہیں ہم لوگ

منزلوں کے سراب سے آگے
راستوں کا وقار ہیں ہم لوگ

کسی اَوجِ ہوا پہ رقص کناں
کوئی موجِ غبار ہیں ہم لوگ

نشہ زارِ وجود میں - جیسے
اک مسلسل خمار ہیں ہم لوگ

آخری سانس تک - یہی اک زعم
آخری اک حصار ہیں ہم لوگ

اپنی اپنی انا کے ہاتھوں ، حبیبؔ
کتنے بے اختیار ہیں ہم لوگ

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

بہ جرم بیگناہی (کون پوچھتا مجھ کو!)
صلیبِ وقت پہ لٹکا دیا گیا مجھ کو

بس اتنا جانتا ہوں ایک زرد پتا ہوں
اُڑائے پھرتی ہے جانے کہاں ہوا مجھ کو

میں ایک عمر سے اپنے ہی اختیار میں ہوں
کرے گا کیا کوئی اِس قید سے رہا مجھ کو

خبر مجھے بھی ہے اک روز (اور وہ دُور نہیں)
جلا کے راکھ ہی کر دے گی یہ انا مجھ کو

نگاہِ شوق - بتا کوئی صورتِ تسکیں
حریمِ ناز - دِکھا کوئی راستا مجھ کو

ترے فراق میں یہ سانحہ بھی گزرا ہے
ترے خیال کا پرتو ہی ڈس گیا مجھ کو

میں چنتا رہتا ہوں پلکوں سے کرچیاں دن بھر
کوئی دکھاتا ہے شب بھر اک آئنہ مجھ کو

کہ جیسے میں کسی آسیب کی گرفت میں ہوں
خود اپنا آپ بھی لگتا ہے دوسرا مجھ کو

وہ مسکراتا ہوا جسم جب سے دیکھا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا - یہ کیا ہوا مجھ کو

بہارِ نشہ تھی قوسِ قزح پہ رقص فشاں
پکارتا ہے ابھی تک وہ ذائقہ مجھ کو

میں برگِ ذات میں خوشبو کی طرح گم تھا حبیبؔ
ہوائے شوق نے برباد کر دیا مجھ کو

☆☆☆

ڈاکٹر ضیاء الحسن

عبدالرشید کا شعری آہنگ

ساٹھ کی دہائی اُردو ادب میں نئے تجربوں کی شمولیت کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔ پہلی فوجی حکومت، اظہار کے مسائل، لسانی تشکیلات، شعور کی رو، علامتیت، تجریدیت، اینٹی غزل، نثری نظم اور جانے کیا اس دہائی کے مختلف حصوں میں آغاز ہوتے رہے لیکن ان سب کا حاصل جمع شخصی تشبیہات سے مزین زبان ہے جو شخصی ہونے کی وجہ سے تفہیم کو دشوار بناتی رہی ہے۔ اس زبان کے اثرات جن شاعروں نے قبول کیے ان میں سب سے نمایاں نام عبدالرشید کا ہے۔

عبدالرشید کے اسلوب کی تشکیل میں سب سے نمایاں زبان کا یہی مختلف برتاؤ ہے۔ یہ زبان مبہم ہے۔ کیا یہ ابہام بے معنی ہے یا تخلیقی؟ اس اسلوب کا سارا دارومدار اس ایک سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ دِل کا پتھر، غم و وحشت کی سرا، شب افسردہ، دل کا پھاٹک، گردِ سفر کا تعویذ، لمبی راہوں کی خنک بانہیں، تپتے مہینوں کی بجھی راکھ، اپریل کی گالیاں، مرہم جیسے پانی، ماضی کی سیہ، بیج، یہ سب تشبیہات ''بنکاک میں اجنبی'' کی پہلی نظم ''سفر آغاز کریں'' سے مختلف کی گئی ہیں۔ دو صفحے کی مختصر نظم میں تشبیہات کی یہ فراوانی اس اسلوب کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، جو عبدالرشید کے اس مجموعے اور دیگر تمام مجموعوں کی بنیادی خصوصیت ہے۔ سمیع آہوجہ، انور سجاد، جیلانی کامران، ظفر اقبال اور اس دور کے دیگر کئی تخلیق کاروں کا اسلوب انہی شخصی تشبیہات سے متشکل ہوا ہے۔

''بنکاک میں اجنبی'' منظوم سفر نامہ ہے جو نظموں پر مشتمل ہے۔ ''بنکاک میں اجنبی'' ایک طویل نظم ہے اور اس کے علاوہ بھی اور بہت سے زاویے ہیں جن سے اس مجموعہ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے اس مجموعہ کا مطالعہ ایک طویل نظم کے طور پر کیا ہے جسے شاعر نے مختلف بحروں اور موضوعات سے ترتیب دیا ہے۔ یہ طویل نظم شاعر کے بنکاک میں مختلف مشاہدات، تجربات اور احساسات پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کی اس وقت تک کی زندگی کے کل تجربات کا نچوڑ ہے۔ عین ممکن ہے یہ نظمیں لکھتے ہوئے عبدالرشید کے ذہن میں ایسا کوئی تصور موجود نہ رہا ہو لیکن اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اُنہوں نے متنوع تجربات سے ایک طویل نظم کی بنیاد رکھی ہے۔

اس نظم میں ایک شہر ہے جہاں شراب اور شہوت کی فراوانی ہے۔ غربت اور دولت کی فراوانی ہے۔ بھوک اور غذا کی فراوانی ہے۔ اس شہر میں نظم کے کردار کا قیام چند روزہ ہے اور وقت معین پر اسے واپس اپنے شہر کو جانا ہے۔ اس میں دونوں خطوں کی زندگیوں کا بیان بھی ہے اور موازنہ بھی۔ پھر بارش ہے جو پتے، مارسیہ، خواہش، یادگریہ، وصل شدہ بستر، محتاجی، بیزار دِن، لکڑی کے سٹوپا، پیڑ، مندر کی گھنٹی،

ناممکن وصل کے میدان، شہ زور کی لاٹھی، بچپن کے گلیارے، آغاز جوانی کی ڈیوڑھی، قرادوں کی تھیلی، خوشی، تنہائی، غم ___ ہر شے پر گمراہی ہے۔ سانپ ہے جسے حوّا نے دیکھا اور جو زمین کی شادابی کے لئے جنت سے بارش لایا جو ہر گھر کا رکھوالا ہے اور گھر کی ہر شے میں ہے۔ ازدواجی زندگی، عشق، شاداب بدن، بے وفائی، بے وفائی کی بے معنویت اور زندگی کی بے معنویت۔

بے حاصل یہ کھیتی ہے/ بے برکت ہے اس کا رزق/ کالے کپڑوں میں ملبوس/ خود کو اب جھنجھوڑتا ہوں/ اپنی ہی تحریر سے اب/ سر اور ماتھا پھوڑتا ہوں (میں خط لکھتا رہتا ہوں)

اس ہنگامہ پرور، عشق پرور، حسن پرور زندگی سے، اس انروہ پرور اور بے معنویت سے بھرپور زندگی سے شاعر لوٹتا ہے تو اس کے ساتھ ایک خالی پن رہ جاتا ہے۔

میں خالی جھولی آیا/ اور ہاتھ بھی میرے خالی اور آنکھیں بھی ہیں خالی (اے پرندوں کی قوس)

اس شاعر کا عروضی تجزیہ تو کوئی ماہرِ عروض یہی کر سکتا ہے۔ میں عروض سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتا۔ مجھے اس آہنگ سے دلچسپی ہوتی ہے جو نظم کے موضوعاتی اور پہنتی باطن سے پھوٹتا ہے۔ شاعر جب شعر کہتا ہے تو کسی خاص بحر کو پیش نظر رکھ کر نہیں کہتا۔ وہ ایسا کر سکتا ہے لیکن عموماً ایسا کرتا نہیں ہے۔ نظم کی بحر یا آہنگ کا یقین شاعر کسی تخلیقی رو میں کرتا ہے۔ یہ بحر یا آہنگ شاعر کی ذات، اس کے مسائل، کسی خاص نظم کے موضوع یا ہیئت اور اس خاص کیفیت کی دین ہے جس میں شاعر نظم تخلیق کرتا ہے۔ آہنگ کا یہ انتخاب ایک پیچیدہ ترکیب سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس پیچیدگی کا کُل تجزیہ ممکن نہیں ہے مسکین کسی حد تک اسے دریافت کیا بھی جا سکتا ہے۔ اس بات کو ہم عبدالرشید کی کسی ایک نظم سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ___ کوئی سی بھی نظم مثلاً مسز قیرارس۔ نظم بظاہر آزاد نظم کی سادہ سی ہیت میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس نظم کی بحر مسلسل ہے لیکن آہنگ مسلسل نہیں ہے۔ شاعر مفاعلین کے مسلسل ٹکڑوں سے نظم کا آہنگ ترتیب دیا ہے لیکن مختلف مقامات پر مفاعلین کو توڑ کر مصرع ختم کیا ہے اور پھر نئے مفاعلین سے نئے حصے کا آغاز کیا ہے۔ کئی حصے ''وہاں تقریر جاری تھی'' سے شروع ہوتے ہیں لیکن تمام نظم میں ایسا نہیں ہے۔ شاعر نے یہ حصے ترتیب کے مصرع دیتے ہوئے اور نظم کا آہنگِ متعین کرتے ہوئے مختلف کیفیات اور موضوعات کو پیش نظر رکھا ہے۔ نظم بنیادی طور پر ایک میٹنگ کی روداد ہے جس میں نظم کے کردار کی ذہنی اور نفسی کیفیات کو پیش کیا گیا ہے۔ نظم کا کردار اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے سلسلے میں اپنے ملک سے بنکاک آیا ہوا ہے۔ یہاں وہ تربیتی کورسوں، سیمیناروں اور میٹنگوں میں حصہ لیتا ہے۔ انہی میٹنگوں میں سے ایک میٹنگ کے دوران میں مسز نیرارس اس نظم کے کردار کو محبوبانہ انداز میں سلام کرتی ہے۔ مسز نیرارس اس کردار کی ایک ہم کار جس کے وصال کی آرزومندی اس کے رگ و پے میں جاری ہے۔ مسز جو اس کے قیام کے دوران میں اس سے بے تعلق رہتی ہے اور اب جبکہ بنکاک سے واپسی طے ہے، اس کا التفات ظاہر ہوتا ہے۔ یہ التفات کردار کے اندر محرومی اور ملال کی بے پناہ کیفیت پیدا کرتا ہے۔ میٹنگ جاری ہے لیکن وہ کردار میٹنگ کے ایجنڈے سے نکل جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ واپسی تو طے ہے، جو مختصر

وقت باقی رہ گیا ہے۔ اُس میں وصال کا لطف کشید نہیں کیا جا سکتا۔ جو وطن واپس جا کر تادیر یاد رہ سکے، اس مختصر وقت میں تو ڈھنگ سے بوسہ بھی نہیں لیا جا سکتا۔

نظم کے اس حصے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ واپسی کا وقت متعین ہے اور ٹل نہیں سکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس کی خواہش سارے قیام میں دِل کو گرماتی رہی ہے، وہ مل گیا ہے تو اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی صورت نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ بنکاک ہے جس میں قیام چند روزہ ہے اور جہاں سے واپسی متعین ہے جس میں ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ جس مقصد کی خواہش، اضطراب اور تگ ودو میں زندگی گزاری وہ بے حد لایعنی ہے۔

نظم میں ایک میٹنگ بھی جاری ہے جس میں ہیجتی ہوئی لڑکیاں، نشے کا شکار نوجوان، خود کو ٹیکا لگاتی غربت زدہ ماں اور مکمل مچھر مارتی بوڑھی، عورت کے بارے میں تقریر جاری ہے۔ یہ سارے منظر بھی زندگی کا لایعنیت سے ترتیب پاتے ہیں۔ تقریر کرتے ہوئے حکومتی اہلکار اسی منافقت اور بے رحمی کا استعارہ ہیں جو اہلِ اقتدار کا خاصہ ہے۔ نظم کو شاعر نے موضوعاتی، ہیئتی اور معروضی تینوں حوالوں سے ۹ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصہ ایک پورا منظر ہے اور ہیئتی حوالے سے دوسرے حصوں سے مربوط بھی ہے اور الگ بھی۔

موضوع ایک ہے لیکن موضوع کی پوری معنویت کھولنے کے لئے شاعر نے اسے بھی نو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ نظم کا آہنگ ہے جس کی ترتیب میں صرف عروض شامل نہیں بلکہ عروض، موضوع اور ہیئت کے ساتھ ساتھ شاعر کے باطنی تجربے سے بھی مربوط ہے۔ عبدالرشید کی نظموں میں یہی آہنگ ملتا ہے۔ رکتا ہوا اور رُک رُک کے چلتا ہوا آہنگ۔ یہ آہنگ قاری کو نظم کے مطالعے کے دوران میں بے پرواہ نہیں ہونے دیتا۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے قاری کو اپنی پوری توجہ نظم کی قرأت پر مرکوز رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ قرأت کے لئے بے آہنگ ہونے خطرہ رہتا ہے۔ ان نظموں کو یا تو آہنگ پر پوری توجہ صرف کر کے یا عروض سے بالکل بے نیاز ہو کر نثر کی طرح پڑھنا پڑتا ہے۔ عین ممکن ہے اس میں کچھ دخل شاعر کی عروض سے بے نیازی کو بھی ہو، لیکن جہاں عروضی سانچہ درست ہے، وہاں بھی یہ مشکل درپیش رہتی ہے۔ آہنگ کی یہ صورت عموماً ان نظموں میں درپیش رہتی ہے جن کی موضوعاتی ساخت جذبے سے زیادہ فکر پر استوار ہو۔ عبدالرشید کی نظموں میں بھی جذبہ زیریں لہر کی صورت رواں نظر آتا ہے۔ سطح پر وجود کو درپیش مسائل غالب نظر آتے ہیں۔ یہ شاعری اپنے آہنگ میں سب سے زیادہ جیلانی کامران کی شاعری کے قریب نظر آتی ہے۔ کچھ یہ مماثلت بھی ہے کہ جیلانی کامران بھی عروضی معاملات میں ایسے ہی بے نیاز تھے جیسے عبدالرشید۔

نظم کے ظاہر سٹرکچر میں عبدالرشید، راشد کی طرف زیادہ لگتے ہیں۔ ایران میں اجنبی اور بنکاک میں اجنبی، مسز فیرارس اور مسز سالامانکا، حسن کوزہ گر، حسن کوزہ گر iv, iii, ii اور مسروشا، مسروشا ii۔ یہ جزوی مماثلتیں ہیں اور جیلانی کامران اور راشد کو خراجِ تحسین پیش کرنے سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں ہے کیونکہ عبدالرشید کی نظمیں مجموعی طور پر ایک منفرد اسلوب اور آہنگ پر مشتمل ہیں جو انہی سے مخصوص ہے۔

ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں

مظفر علی سید بحیثیت مترجم

مظفر علی سیّد کو اُردو تنقید میں اہم مقام و مرتبہ حاصل ہے لیکن ان کی ادبی زندگی کے کئی حوالے پوشیدہ رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ بہت اچھے شاعر اور مترجم بھی تھے۔ ذاتی طور پر وہ نمود و نمائش اور ادبی چرچے کو پسند نہ کرتے تھے اسی وجہ سے ان کا شمار ان معدودے چند ادیبوں میں ہوتا ہے جو صرف اپنے کام سے غرض رکھتے تھے، ان کا کام کو کتنا سراہا جاتا ہے یہ ان کا مسئلہ نہ تھا۔

فنکار اپنے فن کی غایت بنا دے تو اس کے فن کی مختلف جہتوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مظفر علی سیّد تراجم کی حیثیت و اہمیت کے بارے میں ہمیشہ سے گوئٹے کے قول کو دہراتے تھے کہ مغرب و مشرق کا ادب انسانیت کی مشترک میراث ہے۔ ایسی ہی وسیع القلبی اور کشادہ نظر گوئٹے کے دور کے جرمن فلسفیوں کے ہاں بھی ملتی ہے۔ شوپنہار، ہرڈر بلکہ ہیگل تک جس نے جمالیات میں فردوسی، نظامی، سعدی اور مولانا روم کی طرف اہلِ مغرب کی توجہ دلائی۔

مشرقی تہذیبوں میں ترجمے کے فن کا مذہبی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ جدید زبانوں کی نشو و نما اور قومیت کے شعور سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کا احساس مظفر علی سیّد کو بھی تھا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں بھی تعلیم اور طباعت عام ہوتی ہے اور متوسط طبقہ کشمکش حیات میں شریک ہوتا ہے، وہاں اور چیزوں کے علاوہ ترجمے کے فن کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے اس لئے ترجمے کو کسی معاشرے کی روشن خیالی کا مظہر بھی کہا جا سکتا ہے۔''
>
> (مضمون مشمولہ ''اُردو زبان میں ترجمے کے مسائل''، ص ۳۳)

مظفر علی سیّد ترجمے کو دوہری تنقید کا نام دیتے تھے ان کے نزدیک ترجمہ کرنے کی دو وجوہ ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ ہم اپنی زبان کے ہم عصر ادب سے شکایت کرتے ہیں کہ یہ بات تمہارے ہاں کیوں نہیں، دوسرے یہ کہ دوسری زبانوں اور تہذیبوں میں جو ادب پیدا ہو رہا ہے اس کے مختلف اجزا، کو ہم اپنے ادب میں جذبت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کام اس سے تو بہتر ہے کہ ہم باہر کے ادیبوں کے نام گناتے رہیں اور اپنے پڑھنے والوں کو پتہ ہی نہ ہو کہ وہ کیسا ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ محض یورپ کا ادب ہی نہیں بلکہ یورپ سے باہر کا ادب بھی، بالخصوص تیسری دنیا کا ادب بھی لائق اعتناء ہے۔

آج ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ تیسری دنیا میں لوگ کس طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہیں اور ہمارا اُن سے کیا رشتہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقائی زبانوں کے تراجم پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔

مترجم کی حیثیت سے مظفر علی سیّد کو نمایاں مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ وہ ترجمہ کرتے وقت نفسِ

مضمون کو گرفت میں رکھتے تھے اور لفظی ترجمہ کرنے کی بجائے خیال و فکر کو بیان کرنے پر توجہ دیتے تھے۔ انگریزی، فارسی اور فرانسیسی ادب سے ان کو دلچسپی حد درجہ تھی۔ ترجمہ کرنے کی صلاحیت اور دلچسپی کو نکھارنے میں ان کی علمی درسگاہ گورنمنٹ کالج لاہور نے بنیادی کام انجام دیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ''سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی''، پطرس بخاری کی کیمرج سے واپسی پر ۱۹۳۳ء میں قائم ہوئی، جسے ریٹائرڈ پرنسپل گورودت سوندھی کے نام سے منسوب کیا گیا جو گورنمنٹ کالج لاہور کے ڈراما کلب کے بانی اور نگران تھے۔ ابتدا میں اس سوسائٹی کا مقصد مغربی سٹیج ڈراموں کا ترجمہ اور پیش کش تھا۔ پطرس بخاری، امتیاز علی تاج اور صوفی تبسم نے مغربی ڈراموں کے اُردو تراجم فراہم کئے۔ بعد میں اس سوسائٹی کے مقاصد میں توسیع کی گئی اور ڈراموں، افسانوں کے علاوہ تنقیدی مقالات کے تراجم بھی پڑھے جانے لگے۔

یہاں مظفر علی سیّد نے ''بریڈلے'' کے افتتاحی آکسفورڈ لیکچر کا ترجمہ ''شعر برائے شعر'' کے عنوان سے کیا۔ زمانہ طالب علمی میں ہی اُنہوں نے آلڈس یکسلے'' کے طویل مقالے کا ترجمہ ''ادب میں سوقیانہ پن'' کے نام سے اور ڈی۔ ایچ لارنس کے عہد آفریں مقالے ''عریانی اور فحاشی'' کے تراجم پیش کیے۔ یہ ۱۹۵۲ء کا دور تھا جب وہ گورنمنٹ کالج کے ادبی مجلّے ''رادی'' کی ادارت سنبھالے ہوئے تھے۔ اسی بنیادی تربیت کا نتیجہ یہ رہا کہ انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور عربی کے تراجم میں انہیں ملکہ حاصل ہو گیا۔

مظفر علی سید نے ڈی۔ ایچ لارنس کے فکشن کے سلسلہ میں تنقیدی مضامین کو اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کتاب کے دیباچے میں اس تربیت گاہ کو ان الفاظ میں خراج پیش کیا۔

> ''اب مدت سے معلوم نہیں فنِ ترجمہ کی یہ تربیت گاہ کس عالم میں ہے۔ تاہم اس ربطِ باہم کی یاد میں جو اس دیرینہ ادارے کے اراکین اور راقم السطور کے مابین ۱۹۴۸-۱۹۵۲ء کے بارآور برسوں میں قائم رہا اور اس کی سرگرمیوں میں شریک، اساتذہ و طلبہ کی رہنمائی اور رفاقت کے امتنان کے طور پر اس کارِ محبت کو اسی بزم کے نام منتسب کیا جاتا ہے۔''
>
> (اقتباس از دیباچہ ''فکشن، فن اور فلسفہ''، ص ۷)

انگریزی ناول نگار، افسانی نویس اور نقاد ڈی۔ ایچ لارنس کے مقالات کو عمدہ اُردو ترجمے کے ساتھ پیش کرنے کا سہرا مظفر علی سیّد کے سر ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے منتخب مقالات کا یہ ترجمہ کتابی شکل میں ۱۹۸۶ء میں مکتبہ ''اسلوب'' کراچی نے شائع کیا۔ اس ترجمے کو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی اور تقریباً تمام بڑے ناقدین نے اسے سراہا۔ اس ترجمے کے بارے میں مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

> ''لارنس نے فکشن کی تنقید پر جو مقالات لکھے ہیں، ان میں اہم ترین مقالات کو مظفر علی سیّد نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اصل انگریزی مقالات جن لوگوں کی نظر سے گزرے ہیں وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ لارنس کی تنقید کو اُردو میں

پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مظفر علی سیّد نے لارنس کے مطالب کو ایسی خوش
اسلوبی سے اُردو کا روپ دیا کہ ترجمہ پر اصل کا گمان گزرتا ہے۔''

(''اظہاریہ''، مشمولہ ماہنامہ ''اسلوب''، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶)

اس کتاب میں مظفر علی سید نے لارنس کے تنقیدی عمل کی عمدہ وضاحت کی ہے اور ضمیمے کے طور پر لارنس کے منتخب نقاد ادب پر محمد حسن عسکری کا تبصرہ اور ایف۔ آر۔ لیوس کا خط عسکری کے نام شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک مفصل فہرست ان کتابوں کی ہے جو لارنس نے تنقید پر لکھیں اور وہ بھی جو لارنس پر لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں لارنس کے جن مقالوں کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے ان میں ''ناول کیوں اہمیت رکھتا ہے''؟ ''اخلاق اور ناول'' ناول کے مسئلے پر ٹاس ہارڈی کا مطالعہ اور صقلیہ کا ایک ناول جیسے اہم مقالات شامل ہیں۔

ان اہم تنقیدی مقالات کے ترجمے کو اصل کے سامنے رکھ کر پرکھا جائے تو مظفر علی سیّد کی ترجمہ کرنے کی صلاحیت کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس لکھتا ہے:

Why the novel matters?

We have currious ideas of ourselves. We think of ourselves as a body with a spirit in it, or a body with a soul in it, or a body with a mind in it. "men sana incorpore sano". The years drink up the wine, and at last throw the bottle away, the body of course being the bottle".

"D.H.Lawarence Selected Literay Criticism", P.102

اہلِ زبان جانتے ہیں کہ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی زبان کتنی بامحاورہ، شستہ اور رواں ہے اور مندرجہ بالا بیان کو مظفر علی سیّد اُردو زبان میں ڈھالتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھے ہوئے کہ بیان کی اصل روح کو بھی ٹھیس نہ پہنچے اور زبان و بیان کی روانی بھی برقرار رہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''ناول کیوں اہمیت رکھتا ہے''، ہم اپنے بارے میں عجیب و غریب خیالات رکھتے ہیں۔ ہم خود کو ایک جسم سمجھتے ہیں جس میں جان پائی جاتی ہے یا ایک بدن جس میں ایک روح موجود ہے، یا ایک قالب جس میں ایک ذہن بھی ہے ''متوازن بدن میں متوازن دماغ'' سن و سال ساری شراب پی جاتے ہیں اور آخر میں بوتل کو پھینک دیتے ہیں۔ بوتل بلاشبہ بدن کو ہی سمجھا جائے گا۔'' (گلشن فن اور فلسفہ، ص ۳۳)

یہاں (Curiously) کے معنی لغت میں ''جاننے کا خواہشمند، جستجو کرنے والا، عجیب، غیر معمولی، حیرت انگیز، انوکھا، نادر، فحش، شہوت انگیز کتاب وغیرہ درج ہیں۔ (آکسفورڈ، انگلش اُردو ڈکشنری، ص ۳۵۶) جس کے لیے مظفر علی سیّد نے بامحاورہ اُردو میں ''عجیب و غریب'' کا لفظ منتخب کیا اسی طرح "Men Sana in Corpore Sane" کا نہایت بلیغ اور رواں ترجمہ ''متوازن بدن میں متوازن دماغ'' قابل غور ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے مقالہ جس کا "Morality and the Novel" جسے مظفر علی سیّد نے ''اخلاق اور ناول'' کے عنوان کے تحت ترجمہ کیا۔ اس مقالے کا یہ پیراگراف بھی قابلِ توجہ ہے، پورا مضمون مظفر علی سیّد کے فن ترجمہ پر دسترس کا عمدہ نمونہ ہے۔ مصنف ''وین گوخ'' کے فن کے بارے میں لکھتا ہے۔

"When Van Goph paints sunflowers he reveals, or achieves, the vivid relation between himself, as man, and the sunflower as sunflower, at that quick moment of time. His painting does not represent the sunflower itself is. We shall never know what that sunflower itself is. And the camera will visualise the sunflower for more perfectly than Van Gogh can". D.H.Lawarence "Selected Literary Criticism" P.108

اب اس اقتباس کا رواں دواں اور بامحاورہ ترجمہ ملاحظہ ہو، خیال رہے کہ یہ ترجمہ نہ تو آزاد ہے اور نہ ہی لفظ بہ لفظ اس کے باوجود اس میں اپنی زبان کے تمام وسائل کا بھرپور استعمال ملتا ہے اور ان لوگوں کی ذہنیت پر ترس آتا ہے جو اُردو زبان کی کم دامنی کا گلہ کرتے ہیں۔

''جب 'وین گورخ' سرج مکھی کے پھول کی تصویر کشی کرتا ہے تو وہ اپنی ذات (بطورِ انسان) اور سورج مکھی (بطورِ پھول) کے درمیانی رابطہ کو، جو وقت کے اس دھڑکتے لمحے میں روشن ہوتا ہے، منکشف کرتا ہے یا مکتسب۔ اس کی تصویر محض سورج مکھی کی نمائندگی نہیں کرتی کیونکہ ایسی صورت گری تو وین گرخ سے کہیں زیادہ مکمل طور پر ایک کیمرہ انجام دے سکتا ہے۔'' (فکشن فن اور فلسفہ، ص ۴۱)

اس پیراگراف میں "Quick Moment of Time" کا بامحاورہ ترجمہ اس دھڑکتے لمحے میں نہ صرف پورے معنی دے رہا ہے بلکہ جملے کے اندر موجود پوری توانائی کا اظہار بھی ہو رہا ہے۔ عموماً لفظ "Reaveals" بیان کرنے اور Achieve حاصل کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اسے ادبی تنقید کی زبان کے دائرے میں لاتے ہوئے ''فلکشف'' اور ''مکتسب'' جیسے لفظوں کے ذریعے ادا کیا گیا۔

جہاں تک بڑے انسانی رشتوں اور احساسات کا تعلق ہے وہ سبھی انسانوں اور قوموں میں ایک جیسے ہیں۔ مثلاً نفرت، محبت، حسد وغیرہ لیکن ایک ہی رشتے کے تحت کون سے انسانی احساسات آتے ہیں یہ چیز ہر قوم میں مختلف ہوگی۔ قوموں کے تجربات میں بھی یہی امتیاز ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شے کے گرد جو ثانوی مربکات ہوتے ہیں ان کے اجزاء ترکیبی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہیں سے وہ چیز پیدا ہوتی ہے جسے ہم کسی زبان کی روح یا شخصیت کہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان کے ایسے اسالیب بیان اور ذخیرہ الفاظ کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جسے کسی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا، یا کم

ازکم ترجمہ کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ ایسا عموماً تخلیقی، نثر یا شاعری کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہوئے ہوتا ہے۔ مظفر علی سیّد اس مشکل منزل سے بھی بڑی آسانی سے گزرے ہیں۔ انہوں نے ترکی فارسی، روسی اور انگریزی افسانوں، حکایات وغیرہ کا ترجمہ کیا۔ ''کتا اور بیل'' کے عنوان سے چند رومی حکایات کو ''لیل ونہار'' کی ۱۹۵۷ء کی اشاعت میں اکٹھا کیا گیا ہے۔ یہی حکایات ''نقوش'' کے طنز ومزاح نومبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت کا بھی حصہ ہیں۔

مظفر علی سیّد خود روسی زبان نہیں جانتے تھے یقیناً یہ ترجمہ انگریزی ترجموں کے ذریعے ہی اُردو میں آیا لیکن نہایت دلچسپ انداز میں ''کتا اور بیل''، ''گدھا اور بلبل''، ''استرے''، ''عینک اور بندر''، ''اود بلاؤ''، ''ماہرِ تعبیرات''، ''زمیندار صاحب اور کیمرہ''، ''بھیڑیں اور بھیڑیے''، ''پتنگ اور تتلی'' کے عنوانات کے تحت مختصر ترجمہ کی گئی ہیں اور ان کی معنویت میں اضافہ کرنے کے لئے ''لیل ونہار'' نے کارٹونوں کا اہتمام کیا ہے۔ ہر مختصر حکایت کے سامنے ایک کارٹون وضاحتی (Caption) کے ساتھ موجود ہے۔ آخری حکایت پتنگ اور تتلی منظوم ہے۔ تکنیکی اور معنوی لحاظ سے اس منظوم حکایت میں مظفر علی سیّد نے زبان وبیان کے وسائل کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:

ایک پتنگ نے بڑھ بڑھ کے بادلوں کو چھوا
تو نیچے ، وادی میں ، اک تیتری کو دی یہ صدا
یقین مانو ، تمہیں دیکھنا ہی مشکل ہے
نہ جانے چیونٹی ہے ، ذرہ ہے کوئی ، یا تِل ہے
ہوائے شوق کہ مجھ کو اُڑائے جاتی ہے
حسد کی آگ میں تم کو جلائے جاتی ہے
حسد کی آگ ؟ اتنا غرور ! رہ تو سہی
تمہارے بس میں ہے کیا ؟ کھل کے مجھ سے کہہ تو سہی
تم آسمان کا تارا بنی ہوئی ہو کیا ؟
تمہارا جسم زمین تک ہے ڈور میں جکڑا
یہ زندگی تو مسرت سے دور ہے پیاری
تمہیں بلندی پہ ناحق غرور ہے پیاری
جدھر بھی چاہوں اسی وقت مڑ تو سکتی ہوں
مجھے پسند نہیں زندگی کو روگ لگاؤں
کسی کے لطف کی خاطر غلام بن جاؤں

(روسی حکایات، مترجم، مظفر علی سیّد، مشمولہ ''لیل ونہار''، ۱۹۵۷ء، ص ۳۲۔)

''موت کا جشن'' ترکی کے افسانے نگار ''جودت قدرت'' کے افسانے کا ترجمہ ہے جو ''لیل و نہار'' کی ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ مظفر علی سیّد نے اسے ترجمہ کرتے ہوئے تکنیکی اور معنوی دونوں لحاظ سے پریم چند کے افسانے ''کفن'' کو ذہن میں رکھا ہے۔ کیونکہ یہ افسانہ بھی ''کفن'' کی طرح موت کا جشن ہی ہے۔ یہی افسانہ پشاور سے شائع ہونے والی ادبی جریدے ''احساس'' کی عالمی کہانی نومبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں بھی شامل ہے لیکن وہاں اس کا نام ''بھوک اور موت'' رکھا گیا ہے۔

ہفت روزہ لیل ونہار ۱۹۶۲ء میں کارل چاپیک (وفات ۱۹۳۸ء) کے ایک افسانے کا ترجمہ شامل ہے۔ کارل چاپیک چیکوسلواکیا کا مشہور مصنف تھا اس کے اکثر ڈرامے اور افسانے دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوئے۔ اس کے افسانوں کا رنگ منفرد بے حد متین اور دھیما ہے وہ بے حد طوفانی اور ہیجانی باتوں کو آہستگی سے ادا کر جاتا تھا۔ مظفر علی سیّد نے ترجمہ کرتے وقت زبان وبیان کی نرمی پر خاص توجہ دی ہے۔ اس افسانے کا عنوان ''تکون'' رکھا جو شوہر، بیوی اور ایک تیسرے فرد کی چھوٹی سی کہانی ہے۔ مکالمہ نگاری پر بھرپور توجہ دیتے ہوئے ڈرامائی عناصر کو اُبھارا گیا ہے۔

''آج کی دنیا سے اقبال کا ارتباط'' فارسی کا ایک عالمانہ تنقید مقالہ ہے جسے پروفیسر مبر تبریزی نے لکھا ہے۔ اس کا ترجمہ حواشی اور اختلافی تصریحات کے ساتھ مظفر علی سیّد نے کیا جسے ''فنون'' نے ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں شامل کیا۔ مقالے کے ابتدائی وضاحتی نوٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مترجم نے اس مقالے کو انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ایرانی پروفیسر صبر تبریزی نے جو ڈنبر ایونیورسٹی میں شعبہ فارسی کے صدر ہیں، دہلی میں جشنِ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے دوران برطانیہ کے مندوب کی حیثیت سے ۱۹۷۷ء میں یہ مقالہ پڑھا تھا۔ اصل انگریزی متن جو علی سردار جعفری اور کرتار دگل کی ادارت میں چھپنے والی یادگاری کتاب میں سب سے پہلے مقالے کے طور پر شائع ہوا ہے۔

مترجم نے یہ مقالہ انگریزی میں لکھا، پڑھا اور ترجمہ کیا۔ البتہ یہ طے ہے کہ اس مقالے کو اقبال کی فارسی شاعری کی روشنی میں دیکھا گیا ہے کیونکہ فارسی زبان سے مظفر علی سیّد کی واقفیت خاصی تھی۔ وہ فارسی دانشور علی شریعتی کے بہت قائل تھے۔ نیا دور کے جدید ایرانی ادب ۱۹۸۳ء میں علی شریعتی کے ایک تعارف کے ساتھ ان کے وقیع وطویل مقالے ''مسئولیت-فن وادب اور مذہب کی ذمہ داری'' کا ترجمہ بھی شامل ہے جو مظفر علی سیّد نے فارسی سے کیا ہے۔ مظفر علی سیّد نے ترجمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر علی شریعتی کے خطابیہ انداز کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

''نفسِ انسانی کا نغمہ گر'' کے عنوان سے کونریڈ ایکن کا مختصر تعارف اور ایک منتخب نظم ''قند'' کی ۱۹۷۳ء کا حصہ ہے۔ کونریڈ ایکن نے شاعری کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسے اُردو

ترجمے کے ذریعے اُردو دان طبقے تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

جریدہ کے افسانہ نمبر (شمارہ ۳) میں ایک ایرانی افسانے کا ترجمہ شامل ہے۔ ایرانی تخلیق کار جلال آل احمد سے مظفر علی سیّد بہت متاثر تھے۔ ان کی افسانوی تخلیق کا ترجمہ ''سب کا بچہ'' کے عنوان سے کیا گیا۔ جلال آل احمد کی زبان رمز و کتابہ سے مملو تھی اور اس میں ہر بات اشارۃً کہی جاتی تھی۔ اگرچہ عام سادہ بول چال کی زبان اس کا خاصہ تھی لیکن اس میں ایسی پُر معنی اشارے ہوتے کہ قاری شروع سے آخر تک اس کی گرفت میں رہتا ہے۔ اس اہم خوبی کے پیشِ نظر اس افسانے کا ترجمہ بھی سادہ اور روزمرہ کی زبان میں کیا گیا ہے۔ اس میں بچے کی زبان سے جو مکالمے ادا کئے گئے ہیں وہ نہایت فطری معلوم ہوتے ہیں اور ان کا ترجمہ کرتے ہوئے مظفر علی سیّد نے اس فطری انداز کو ملحوظ رکھا ہے جو اصل افسانے میں موجود تھا۔ بچہ کِش مِش لینے کی ضد کرتا ہے اور جب پھیری والے کے پاس کِش مِش دیکھتا ہے تو اپنی امّی سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''امّی دان تِش مِش بھی ہے نا اس کے پاچھ''۔

(افسانہ ''سب کا بچہ''، مشمولہ جریدہ افسانہ نمبر، شمارہ ۳، ص ۴۷)

کسی مترجم کے لئے کرداروں کے اس فطری مکالمے کو اپنی زبان میں ڈھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور مظفر علی سیّد نے اس تخلیقی کاوش کے بنیادی مزاج اور ڈھانچے کو سمجھتے ہوئے اسے اُردو ترجمے کی شکل دی ہے۔ جلال آل احمد کے ایک اور افسانہ کا ترجمہ بھی ''نیا دور'' ۱۹۸۳ء کے خاص نمبر کی زینت ہے۔ اس افسانے کو ''طاقت کی تمنا'' کے عنوان کے تحت ترجمہ کیا گیا ہے اور جلال آل احمد کے اسلوب کی روانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

شعری تراجم زیادہ مشکل اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شعری زبان نثر سے نہ صرف مختلف ہوتی ہے بلکہ اس میں معنوی جہتیں بھی کئی ہو سکتی ہیں۔ خود مظفر علی سیّد کو بھی اس دشواری کا احساس تھا وہ نثری اور شعری ترجم میں فرق کو سمجھتے تھے۔ وہ شعری تراجم کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''شعر کا ترجمہ شعر میں کوئی آسان کام نہیں خصوصاً اُس وقت کہ شاعر کا ذاتی لہجہ اصل زبان کے سانچے میں ڈھل کر اُبھرا ہو۔''

(ایملی ڈکنسن، تعارف و ترجمہ، مشمولہ ''قند''، ۱۹۷۲ء، ص ۶۴)

ایملی ڈکنسن (Emily Dickinson) کا مختصر تعارف اور شعری ترجمہ (مشمولہ قند ۱۹۷۲ء) کافی دلچسپ اور توجہ طلب ہے۔ ایملی کی دونوں نظموں کا ترجمہ کرتے ہوئے ان کے عنوان بھی رکھے ہیں جبکہ ڈکنسن کی نظموں کے عنوان موجود نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

ایک گھونٹ

زندگی ایک گھونٹ پی میں نے	I took one draught of life

قیمت اس کی ادا یہ کی میں نے	I will tell you what I paid
ایک سالم وجود - بیش نہ کم	Precisely an existence
نرخِ بازار تھا یہی اُس دم	The market price, they said
ذرہ ذرہ تلی مری مٹی	The market me. Dust by Dust
کہ ترازو میں نہ تھی جائے نفس	They balanced film with film
مل گیا مول مجھ کو جو ہستی کا	Then handed me my being's sworth
اک رَتی بہشت کی اور بس	A single dram of heaven!

(ایضاً، ۶۵)

یہاں ایملی ڈکنسن نے اپنی زبان و ثقافت کے استعارات اور تشبیہات سے استفادہ کیا ہے اور ترجمہ کرتے ہوئے مظفر علی سیّد نے اصل معنوی قوت اور روح کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی زبان سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ یہاں "Market Price" کے لیے ''نرخِ بازار'' کی اصطلاح نہ صرف صوتی اثرات میں عمدہ ہے بلکہ پورے معانی و مفہوم کو بھی سامنے لاتی ہے۔ "They weighed me. Dust by Dust" کے لئے ''ذرہ ذرہ تلی مری مٹی'' معنوی اور تکنیکی لحاظ سے بھرپور ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ اب انگریزی محاورے They balanced Film with Film جتنا رواں اور پُر معنی ہے اتنا ہے اس کا اُردو ترجمہ ''ترازو میں تھی نہ جائے نفس'' قابلِ فہم اور عمدہ ہے۔

ایملی ڈکنسن کی شاعری کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اسے کم سے کم اور چھوٹے سے چھوٹے جملے میں زیادہ سے زیادہ بات کرنا ہے اور لفظوں کے بین اسطور بھی کافی کچھ رہتا ہے۔ ایملی کی نظموں کا ترنم، قافیہ اور موزوں اوقات کی طرف فطری رجحان اس بات کا متقاضی تھا کہ اسے ترجمہ کرتے ہوئے بھی وہی لب و لہجہ برقرار رکھا جائے۔ مظفر علی سیّد نے اس باریک نکتے کو ترجمہ کرتے ہوئے پیشِ نظر رکھا ہے۔

''والیس اسٹونز'' کی ایک نظم کا ترجمہ بعنوان ''پتوں کے نیچے'' قند کی ستمبر ۱۹۷۲ء کی اشاعت میں شامل ہے۔ اس نظم کا ترجمہ کرتے ہوئے۔ مظفر علی سیّد نے فارسی تراکیب اور الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں۔ کئی نئی تراکیب عمدہ معلوم ہوتی ہیں اور موسیقیت و ترنم کا بھی اہتمام دکھائی دیتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

چیختے پتے ہیں، ان کی چیخ میں کیا آسمانی التفات
کوئی انسانی الم، مرگِ دلیراں کا دھواں اس چیخ میں مخفی نہیں
چیختے پتے کہ جن کے ماورا کچھ بھی نہیں/۔ بے تصور کون کر سکتا ہے معنی کی تلاش
گوش کی پرواز کیا، دریافت کیا اس کے بغیر
آخرش اک چیخ ہے جس سے کسی کو واسطہ کوئی نہیں

(مشمولہ ''قند''، ۱۹۷۲ء، ص ۴۲)

مرگِ دلیراں، بے تصور، گوش کی پرواز چند ایسی تراکیب ہیں جو اختراعی ذہن کی نشاندہی کرتی ہے۔ کونریڈ ایکن Conrad Aiken کی ایک نظم کا شعری ترجمہ (مشمولہ انتخاب ''قند'' ۱۹۸۲ء) پیش کرتے ہوئے بھی ایسی ہی نکتہ آفرینی سے کام لیا گیا ہے۔ نظم کا ایک حصہ اور اس کا ترجمہ بطور نمونہ ملاحظہ ہو۔''

اے کہ پندارِ نفسی میں اتراتے پھرتے ہو	Olittlefoplingsofteh pride of mind
جملوں کو رکھتے ہو عطرِ حنا میں بسا کر	Whowarpthephraseinlavender, andkeepit
کہ اک روز ان کی نمائش کرو	Inordertodisplayit
اور تم، جو ہماری محبت کو ہم سے بچاتے ہو	Andyou, whosaveourloves
گویا محبت کو کافی نہ ہوں کائناتیں	Asifwehadnotwordsoflove enough

(''قند'' انتخاب نمبر ۱۹۸۲ء، ص ۴۹)

اس ترجمے میں لفظی اور معنوی لحاظ سے کوئی کمی نہیں اور تخلیقی فنکار کا کوئی لفظ یا خیال ضائع نہیں ہوا اور ترجمے میں ڈھلتے ہوئے اُردو دان طبقے کو وزن یا بحر سے بھی شکایت نہیں ہو سکتی۔

''جون اسٹالوردی'' کی ایک نظم کا ترجمہ ''سندھن'' کے عنوان سے ''افکار، ۱۹۸۱'' کا حصہ ہے۔ اس نظم کا ترجمہ کرتے ہوئے مظفر علی سیّد نے جون اسٹالوردی کے اس جذبۂ خیر سگالی کو خراج پیش کیا ہے جو ان کے دورہ پاکستان کی یادگار ہے۔ جون اسٹالوردی نے ایک سندھی عورت کو موضوع بنایا ہے۔ سندھی عورت جو مشقت کی عادی ہے اور اپنا بوجھ خود اُٹھا سکتی ہے۔ اس ترجمے میں اصطلاحات اور الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ ہماری مٹی اور ثقافت کی خوشبو میں رَچے بسے ہیں جیسے:

''اس کے رخ کے پیچھے چندری جھول رہی ہے
سر پر اک سنگین مرتباں دھرے
ہوا میں بہتی جاتی ہو
اپنی چال میں کوئی جھٹکا لئے بنا'' (ایضاً ص ۳۸)

''محراب'' کی اشاعت ۱۹۸۲ء میں ایک گجراتی شام غلام محمد شیخ کی نظم ''جیسلمیر'' کا ترجمہ کیا ہے۔ ''جیسلمیر'' راجھستان کا ایک قلعہ بند شہر ہے، جس کا نام ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہر ایک کی زبان پر تھا۔ مگر یہ نظم اس سے نو (۹) سال پہلے لکھی جا چکی تھی۔ شاعر غلام محمد شیخ گجراتی زبان کے ایک فکری جریدے کے مدیر بھی تھے اور تاریخ فن جمالایت کے اُستاد بھی۔ ان کی نظم کا ترجمہ مظفر علی سیّد نے اس طرح کہا کہ ہر منظر اور اس کی جزئیات ایک دوسرے میں گم ہو کر متحرک ہو جاتی ہے۔

''غیر جدید'' انگریزی نظموں کے عنوان کے تحت چند ایسے شعراء کے کلام کا نمونہ اُردو زبان میں پیش کیا گیا جو یا تو انگریزی شاعری میں جدید تحریک شروع ہونے سے پہلے وفات پا چکے تھے یا وہ ایلیٹ، پاؤنڈ اور ژیٹیس ایسے جدید شاعری کے اماموں سے غیر متعلق تھے۔ یہ نمبر جدید انگریزی نظمیں

''اسلوب'' ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں شامل ہیں۔ جن شعراء کے شعری تراجم کئے گئے ان میں ایملی، برونٹی، ٹومس ہارڈی، جی۔ ایم۔ ہوپکنز، کپلنگ، جیمز جوائس اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی تخلیقات ہیں۔ ان تراجم کے بارے میں مظفر علی سیّد لکھتے ہیں:

''اب ترجمے پر چند گزارشات، اصل نظموں کی طرح اکثر ترجمے بھی ایک جیسی پابندیوں کے ساتھ کئے گئے ہیں۔ تاہم محض قافیے کی مجبوری سے حشو و زوائد کے اضافے سے پرہیز کیا گیا ہے۔''

(غیر جدید نظمیں تعارف و ترجمہ، مشمولہ اسلوب، ۱۹۸۳، ص ۵۸۳)

اِن تراجم سے اصل شاعر کے کمالات یا کم سے کم اس کے فکر و احساس کی پہلو داری کا بہتر اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ وہ خود شاعر تھے اس لئے شاعرانہ تلازمات تک ان کی رسائی عام ناقدین سے زیادہ تھی۔ ان کی ذاتی کاغذات کی چھان بین کے دوران چند نمبر مطبوعہ نثری و شعری تراجم بھی ملے جن کے عکسی نمونے میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں سے چند تراجم تواریخ کے ساتھ ہیں مثلاً (چکنی مٹی کا گلدان ۱۹۴۵ء)، گٹھن، نظر سے صبر تک، شکستہ گوزہ اور سیسلی کے افسانہ نگار ''جووِلی ورگا'' کے افسانے کا ترجمہ ''چھنال دیدہ، خرابوں میں پھرتے ہوئے مناجات، میکسکو کی ایک نظم کا ترجمہ ہے۔'' انجیر مقدس ''پراژھنا'' اور ''مساس'' جیسے تراجم شامل ہیں۔ ان غیر مطبوعہ تراجم کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایک لفظ پر کتنی محنت کرتے تھے۔ انہیں کئی بار کاٹتے اور بنیادی تنقیدی شعور کا استعمال کرتے ہوئے اُردو زبان کے ذخیرے میں سے بہترین کا انتخاب کرتے تھے۔

مظفر علی سیّد کی بحیثیت مترجم کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اُنہوں نے تراجم کو محض تراجم نہیں سمجھا بلکہ وہ انہیں فن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطہ نظر کی پیداوار گردانتے تھے۔ انکے نزدیک تراجم بین الاقوامی اندازِ نظر پیدا کرنے کا وسیلہ ہوتے ہیں۔ ترجمے کی عربی تعریف کے مطابق ترجمہ ''نقل کلام'' کا تقاضا یہ ہے کہ جس زبان میں نقل ہو اِس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا کرے جیسا اصل زبان میں ہوا تھا۔ ہمیں ترجمے سے کوفزدہ ہونے کی بجائے اس تنگ نظری سے خوفزدہ ہونا چاہیے جو اثر انگیزی کا دعویٰ تو رکھتی ہے لیکن اثر پذیری کو حرام سمجھتی ہے۔ دراصل عالمی ادب کے تصور کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے اور مظفر علی سیّد جیسے وسیع المطالعہ شخص کے لئے یہ کام اس لئے بھی دلچسپ تھا کہ وہ اپنے قارئین کو محض یورپی ادیبوں کے ناموں متاثر کرنے کی بجائے ان کے کام سے براہِ راست متعارف کرانا چاہتے تھے۔

☆☆☆

نسیم عباس امبر

مابعد جدیدیت کے بعد گیری پوٹر، جوزلو پنر

یہ بہترین وقت ہے۔ یہ بدترین وقت ہے۔ یہ مغالطوں کی تقریب کا وقت ہے۔ یہ کسی مختلف شخص کے لئے خوف کا وقت ہے، یہ ٹیکنیکل حیرتوں کا وقت ہے۔ یہ سائنس کے خوف اور بے اعتباری کا وقت ہے، یہ سائنس کے خوف اور بے اعتباری کا وقت ہے۔ یہ بے نظر امارت اور خوفناک غربت کا وقت ہے۔ یہ پرانے کے لئے ناسٹلجیا اور نئے کے لئے جوش و جذبے کا وقت ہے۔ یہ رجائیت اور انسانیت کی آزادی اور خوشی کے امکانات کے لئے اُمید افزا وقت ہے۔ تاہم مہیب قنوطیت اور مستقبل کے بارے میں خوف کا وقت ہے۔

یہ عظیم ذہنی کامرانی کا وقت ہے، ذہنی اور سائنسی خلاق کے حالات میں شدید قدرتی حدود سے پرشوق آگہی کا وقت بھی ہے۔ یہ سال بہت سے سالوں سے مشابہہ ہے لیکن کسی گزرے ہوئے سال کی طرح ناپسندیدہ بھی ہے۔ یہ سال ۲۰۰۰ء ہے۔ نئی صدی میں داخل ہونے کا راستہ ہے۔ یہ رُکنے اور عقل، فلسفہ اور سائنس کے کردار کی قدر و قیمت کے دوبارہ تعین کرنے کے لئے موزوں وقت ہے۔

ایسا کرتے ہوئے، مابعد جدیدیت کے ذکر سے بچنا ممکن ہے۔ اوّل کیونکہ یہ بیسویں صدی کی آخری تہائی میں علمی دنیا کو بہا کر لے جانے والی غیر اہم ذہین آبشاروں میں سے ایک تھی، دوم، کیونکہ یہ ایک ذہنی آبشار تھی جس نے عقل، معروضیت اور علم کی روایت یافتہ خود اعتمادی کو شدید زخم پہنچائے۔ یہ (مابعد جدیدیت) سوشل سائنسز اور اخلاقیات میں زیادہ بااختیار تھی۔ اگرچہ، زیادہ تر نیچرل سائنسز کے بارے میں بھی سب کچھ یہی کہا کرتی تھی۔ خاص طور پر، یہاں تک موخرالذکر کا تعلق ہے۔ مابعد جدیدیت نے اس میں علم کی تحدیدی بنیادوں سے لے کر روشن بنیادوں تک کو ___ بنیادی چیلنج پیش کیا۔ کوئی غیر فیاضانہ انداز سے کہہ سکتا تھا کہ بدقسمتی سے اس نے اُن بنیادوں کو انتہائی غیر مدلل چیلنج پیش کیا تھا۔ دوسری جانب، یہ دعویٰ بھی ثابت کیا جاسکتا تھا کہ اس نے فلسفیانہ بنیادوں کے حقیقی تصور کو کئی مسائل پیش کیے اور تنقیدی طور پر علم، عقلیت، سائنس اور جدیدیت کے انسانیت سے متعلقہ افکار کے لئے بہت سے مسائل کے انبار کو ظاہر کیا۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاسکتا تھا کہ مابعد جدیدیت نے تمام تضادات کو، اپنے ہم عصر عہد کے داخل (باطن) کو زیرِ اثر لانے کے لئے پیش کیا۔ چاروناچار، مابعد جدیدیت نے علمی دنیا کی قیود سے فرار کے لئے کچھ اہتمام کئے اور ''مابعد جدیدیت'' اور ''پسِ ساختیات'' کی اصطلاحات، صحافت اور مقبول عام بحث کو مباحثہ میں داخل ہوگئیں۔

سوشل سائنس اور اخلاقیات کے مختلف میدانوں میں، مابعد جدیدیت مختلف انداز سے قبول کی گئی۔ شاید یہ ادبی تنقید میں زیادہ اہمیت کی حاصل تھی۔ لیکن اس کے اثرات نہ صرف سوشیالوجی اور تاریخ جیسے میدانوں میں محسوس کئے گئے بلکہ اس نے معاشیات اور شماریات کو بھی مَس کیا۔ مابعد جدیدیت نے مختلف میدانوں میں سے ہر ایک کو نہ صرف مختلف درجوں پر متاثر کیا بلکہ ان پر اس کے اثرات اوّل آخر بنیادوں پر تھے۔ اب کچھ تو شاید صرف اِسی سے اصطلاحات لانے لگے۔ تاہم یہ کہا گیا کہ سن ۲۰۰۰ء میں ایک عجیب و غریب ذہنی واقعے کے طور پر مابعد جدیدیت واحد اہم حقیقت ہے۔ یہ زوال کی حالت میں ہے! یہ آہستگی سے جاری ہے۔ اس کے اچھے یا برے اثرات بھی جاری ہیں لیکن مابعد جدیدیت اب استعمال کے زیادہ قابل نہیں رہی ہے۔

کچھ ماہرینِ علوم، متذکرہ بیانات کو ادھورا تاثر محسوس کر سکتے ہیں تاہم کیا آج یہ قابلِ اعتراض ہے کہ مابعد جدیدیت کے تمام بنیادی دعویٰ شرمناک دکھائی دیتے ہیں اور بہت سے اپنے ہی حلقے میں مقید ہو چکے ہیں۔ اِس کا سادہ مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی اہم بصیرتیں، اُن علمی میدانوں کا اہم حصہ بن چکی ہیں۔ جنہوں نے پہلے اسے جوابی کارروائی کے حوالے سے چیلنج کیا تھا۔ اس کے باوجود بھی مابعد جدیدیت کے پرجوش حامی اب اُن (علمی میدانوں) سے پَرے سوچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ اب بھی پرانی اصطلاحات (علمی میدانوں والی) کا استعمال جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے شاید اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے بعد کس تصور کو آنا ہے؟

یہ سوال اپنے اندر ایک مکمل جواب رکھتا ہے کہ ''ایک دوسرا'' مابعد جدیدیت کے بعد کسی چیز کا آنا کیوں ضروری ہے؟ اس کا جواب دو سطحیں رکھتا ہے۔ اوّل سادہ طور پر یہ ایک عمرانی حقیقت ہے کہ ذہنی اور علمی زندگی کے بھی اپنے فیشن اور جوش و جذبے ہوتے ہیں۔ کوئی نکی مشاہدہ کرسکتا ہے کہ ایک کا خاتمہ، سوچ کی نئی منہاج یا دبستان کو اُبھارتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرا جلد ہی جنم لے گا۔ بہت سے عوامل فیصلہ کریں گے کہ اِس حوالے سے مابعد جدیدی تکے بعد، اُن میں سے کون، توضیحی قوت اور منفعت وجود کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ مابعد جدیدیت کی کامیابیوں میں علم کی عمرانی قطعیت کی وسیع شناخت، شامل ہے۔ تاہم ہمیں کم از کم یہ سیکھا چکا ہے کہ علمی دُنیا کے جوش و جذبے کے پھیلاؤ کا باعث اب جو بھی ہو گا اسے موجودہ تصورات اور طریقوں میں سے بہتر ہونا ہی ضروری نہیں ہے۔ ذہنی فیشن کی پیشن گوئی کرنا مشکل ہے۔ مابعد جدیدیت کی دوسری کامیابی، ذہنی اور سائنسی ترقی کے پرانے سادہ تصورات کو شدید مسائل زدہ کرنا ہے۔ ہم صرف اُمید کر سکتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کے بعد جو بھی آئے گا وہ یقیناً بہتر ہوگا۔

دوم نہایت اہمنکتہ ہے۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ مابعد جدیدیت کے بعد کوئی نئی اور مختلف ذہنی سمت سامنے آنی چاہیے کیونکہ ہم جس وقت میں زندہ ہیں، وہاں مابعد جدیدیت کا ذہنی ردِعمل ادھورا ہے۔ کچھ عرصہ سے یہ شعور بڑھ رہا ہے کہ اس کے بغیر، اب جو بھی نیا تصور ہوگا وہ قطعی واضح ہو۔ اس کتاب کا

عنوان، مکمل طور پر یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ ''حقیقت پسند تنقید'' اس نئی صدی کے فلسفیانہ، سائنسی اور سوشل سائنسی چیلنجوں کا سامنا کرتے ہوئے ایک معقول اور مفید فریم ورک پیش کرتی ہے۔

پہلے نکتے کی طرف واپس آتے ہیں کہ کیا یہ تصور بھی مقبولیت اور شہرت کی ایسی ہی حیثیت حاصل کر سکتا ہے جتنی کہ مابعد جدیدیت کی بابت دیکھی گئی ہے۔ تاہم یہ ایک مشکوک بات ہے۔ اس (حقیقت پسند تنقید) کے اور مابعد جدیدیت کے درمیان نمایاں اختلافات ہیں جو کہ ایسے ہی کردار کے حصول کے لئے باہم برسرِ پیکار ہیں۔ مابعد جدیدیت کے بیشتر اختلافات کے مرکزی اجزاء میں سے ایک نیچرل اور سوشل دنیا، زبان اور معنی کی غیر متحول پیچیدگی کی نام نہاد دریافت تھی۔ کیونکہ کچھ پیچیدگیاں ایسی تھیں جنہیں سادہ بنانے کی کوشش ناکام ہو جائے گی۔ اسی لئے مابعد جدیدیت کا تصور، زیادہ تر پیچیدگی کے انعکاس یا بہ نفسہ پیچیدہ بننے پر مطمئن ہو گیا۔ سوشل دُنیا میں قائدانہ معانی کے حتمی نقصان کی اتنی زیادہ وضاحت نہ کی بلکہ بیانیہ اور خطیبانہ انداز کی تمام اقسام کے ذریعے، اسے متن میں دوبارہ تخلیق کیا گیا۔ یہ انداز، اسلوب اور استدلالیت تک چلا گیا۔ جو کہ بہت غیر موزوں اور گمراہ کن، تجریدی نسبتاً علامتی تھا۔ اس اسلوب نے ابہام اور اعلیٰ ترین طنز کو دعوت دی۔ اپنی بدترین حالت میں، اس اسلوب نے علامت، منطق ربط اور تسلسل کی اصطلاحات کا مطالبہ کیا حتیٰ کہ زبان کی زندہ دلی سبقت لے گئی۔

قارئین، حقیقت پسند تحریر کی لئے کو، مابعد جدید نثر کے بالکل برعکس پائیں گے۔ مابعد جدیدیت اسلوب، ابہام اور پیچیدگی کو مدعو کرتا ہے جبکہ حقیقت پسند اسلوب، واضح انداز اور سادگی کے لئے کوشاں ہے۔ بے شک، اس حوالے سے حقیقت پسند تنقید ہمیشہ اپنے مقاصد حاصل نہیں کرتی ہے۔ بلاشبہ قارئین، اس کتاب کے کچھ حصوں کو دوسروں کی نسبت زیادہ آسان پائیں گے۔ تاہم یہاں قارئین، خیالات کو مشکل محسوس کرتے ہیں۔ وہاں وہ کم از کم یہ اطمینان محسوس کر سکتے ہیں کہ یہ تصورات ہیں جو کہ اظہار کے وسیلوں کی نسبت پیچیدہ ہی ہوا کرتے ہیں۔ تاہم، مابعد جدیدیت کی ذہانت کی مقبولیت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ مکمل طور پر کبھی بھی واضح نہیں ہوا تھا کہ ''مابعد جدیدیت کیا تھا یا ہے؟'' اس کے کچھ صاحب اختیار مفکروں نے مستقل طور پر اس عنوان سے انکار کر دیا۔ مابعد جدیدیت نے مغالطوں، اختلافات ابہام اور تنقیص کو بہت مقبولیت بخشی۔ یہ حیران کن نہیں ہے کہ شدید متصادم تصور، عملی مہارتیں اور نام نہاد علوم ایسی ہی پہچان تلے دب جاتے ہیں یا انہیں ایسے ہی عنوان دے دیئے جاتے ہیں۔ ''حقیقت پسند تنقید'' بھی ایک ''وسیع گرجا گھر'' ہے۔ یہاں بھی مفکروں کے درمیان شدید ذہنی اختلافات ہیں، جو ایسے ہی عنوانات دے سکتے ہیں۔ (یقیناً اس کتاب ے بہت سے معاونین کے درمیان بھی ایسے بہت سے اختلافات ہیں) تاہم چار و ناچار، ذہانت سب کو قابو کر لیتی ہے جیسے کہ مابعد جدیدیت کے ساتھ ہوا۔ یہ (حقیقت پسند تنقید کا تصور) کچھ بنیادی دعویٰ رکھتا ہے۔ ان سے کوئی متفق بھی ہو سکتا ہے اور غیر متفق بھی۔ لیکن وہ حقیقت پسند تنقید کی تعریف ایک فلسفے کے طور پر کرتے ہیں۔ کوئی بھی ان بنیادی

دعوؤں کو قبول یا رد کرنے کے لئے، اپنے تعلق کی متناسب وضاحت کے لئے اصطلاحات میں اس کی تعریف کر سکتا ہے۔

اس کتاب کے تمام معاونین، خود کو حقیقت پسند نقاد قرار نہیں دیں گے اس کے برعکس، وہ سب حقیقت پسندوں کی قدرے کم مخصوص پہچان کو قبول کریں گے۔ حقیقت پسندی، ایک فلسفیانہ عنوان کے طور پر اس وقت سے استعمال ہو رہا ہے جب سے فلسفہ وجود میں آیا ہے۔ تاہم اس اصطلاح سے منسوب بنیادی اقوال ۱۹۷۰ء کی دہائی میں رائج ہوئے ہیں۔ کتاب کے تمام معاونین کی طرف سے ''ماورائی حقیقت پسندی'' کو قبول کیا جائے گا۔ باطنی طور پر، کسی کا اپنے آپ کو ایک ماورائی حقیقت پسند یا حقیقت پسند نقاد کا نام دینا، مابعد جدیدیت نقاد کی نسبت، آسان بھی ہے اور قدرے مشکل بھی۔ یہ زیادہ آسان ہے کیونکہ، کچھ بنیادی سوالات، جیسا کہ ''یہ کیا ہے؟'' کے لئے یہ زیادہ واضح اور قطعی ہے۔ یہ بہت مشکل ہے کیونکہ کسی کا خود کو لیبل لگانا، واضح طور پر آپ کو مخصوص نظریات تفویض کرنا ہے۔

''بعد از مابعد جدیدیت-نئی صدی'' کے مرتبین گیری پوٹر اور جوزلو پنر کے دیباچہ کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے۔

ڈاکٹر انوار احمد

''صفروں والا گھر''

کردار:

۱۔ روبی، ایک تعلیم یافتہ، آیئڈیلسٹ لڑکی
۲۔ زمان، روبی کا کلاس فیلو، اسکی رفاقت کا خواہاں
۳۔ پروفیسر، دونوں کا مثالی استاد
۴۔ ماں، روبی کی ماں، ایک سکول کی استانی
۵۔ باپ، روبی کا باپ، ایک سرکاری ملازم
۶۔ شیخ صاحب، زمان کے والد، ایک دنیادار آدمی
۷۔ مس سوال نامہ، ایک ذہین، مگر کنفیوزڈ لڑکی، جسکے سوالات کے سبب کلاس فیلوا سے مس سوال نامہ کہتے ہیں۔

(۱)

(پروفیسر کلاس میں لیکچر دے رہا ہے، کلاس میں زندگی کے آثار ہیں، کبھی کبھار کسی لڑکی یا لڑکے کی مشترکہ کھل کھلاہٹ تخفیف شدہ سرگوشی میں بدل جاتی ہے۔ ایک آدھ مرتبہ موبائل بھی بجتا ہے، دو ایک مرتبہ چوڑیاں کھنکتی ہیں یا کتابیں ڈیسک سے نیچے گرتی ہیں، تاہم مجموعی طور پر لیکچر سنجیدگی سے سنا جا رہا ہے)

پروفیسر: ''بھئی جیسے میں نے ابھی آپ کو بتایا کہ کسی معاشرے کی پہلی اکائی گھر ہے، اُس گھر کے احوال سے کسی معاشرے کی حقیقت یا کیفیت معلوم ہوتی ہے، اور گھر خالی لکڑی اینٹ یا گارے مسالے سے نہیں بنتا، یہ رفاقت کی ضرورت اور اُس کے احساس سے تعمیر ہوتا ہے اور ایثار یا قربانی سے مضبوط ہوتا ہے''

روبی: ''سر جب بھی ہمارے ہاں ایثار یا قربانی کی بات ہوتی ہے تو اُس سے یہی مراد ہوتا ہے کہ یہ صرف عورت کا کام ہے وہ چاہے ماں ہو چاہے بیوی چاہے بیٹی یا بہن، یہ بھی تو آپ سوچئے سر کہ یہ جذباتی استحصال یا ایموشنل ایکسپلائٹیشن نہیں ہے سر؟''

پروفیسر: ''اصل میں آپ کا اپنا ردِعمل کافی جذباتی ہے آج کل نسائی تحریک کے زیرِ اثر کچھ باتیں جذباتی اپیل رکھتی ہیں مگر باپ کو شوہر کو بھائی یا بیٹے کو ایثار یا قربانی کے جذبات سے خالی سمجھنا میرے خیال میں بہت بڑی زیادتی ہے، آپ لوگ نوجوان ہیں اور یہ پوری طرح سے سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ بار برداری سہنے والا باپ ہوتا ہے''

زمان: ''اسی لیے سر بعض باپ پریشان ہو کر دو دو تین تین شادیاں کر لیتے ہیں'' (کلاس ہنستی ہے)

پروفیسر: ''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس طرح کا گھر ہوتا ہے اُسی سے آپ پورے معاشرے کے بارے میں اندازہ کر سکتے ہیں اگر اُس گھر میں ہر کوئی اپنی اپنی خوشی اور اپنی اپنی غرض کو سامنے رکھتا ہے تو آپ کی سمجھ میں معاشرے کی خودغرضی اور نفسانفسی بھی آجاتی ہے اور اگر اس گھر کا کوئی فرد دوسرے کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا تو پھر قوتِ برداشت اور رواداری سے محروم معاشرے کی شناخت مشکل نہیں رہتی۔''

مس سوال نامہ: سر سارا مسئلہ تو کسی صورت حال کا تجزیہ ہے آپ اس طرف آیئے کہ کسی معاشرے میں تحمل یا رواداری کم کیوں ہوتے ہیں یا ختم کیوں ہو جاتے ہیں؟''

پروفیسر: ''تھینکس فار دی سجیشن! میں اُسی طرف ہی آ رہا ہوں کسی معاشرے کی تشکیل میں چار قوتیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں، سیاست، مذہب، تاریخ اور معاشیات ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس حوالے سے کسی معاشرے کے دامن میں بصیرت ہے یا مغالطے، زندگی کو سنوارنے کی اُمنگ ہے یا بگاڑنے کا طاقتور بہانہ۔ اوئے شازیہ تم کس کام میں مصروف ہو میں تم سے مخاطب ہوں رول نمبر ۱۶ اور یہ تمہارے ساتھ بیٹھا شاہد تمہاری کاپی میں کیا لکھ رہا ہے، ادھر آؤ اپنی نوٹ بک دکھاؤ ادھر لاؤ میں پرائیویسی کے احترام پر لیکچر ضرور دے سکتا ہوں مگر میں بے تعلق نہیں ہو سکتا تم سب کی سرگرمیوں سے خاص طور پر کلاس ایکٹیویٹیز سے اور پھر جبکہ میں خود پڑھا رہا ہوں اور آپ لوگ پتہ نہیں میرے بارے میں کیا تبصرے کاپیوں میں لکھے جا رہے ہیں۔ لاؤ لاؤ ادھر لاؤ کہا نا میں نے کہ نوٹ بک ادھر لاؤ''

ایک سہمی ہوئی آواز: سوری سر!

پروفیسر: اوئے یہ کیا ہے؟ اپنی عمریں دیکھیں، کلاسیں دیکھیں اور پھر عادتیں اور عقلیں دیکھیں، دوسری تیسری کلاس کے بچے اس طرح صفر صفر کھیلتے ہیں اور صفروں سے گھر بناتے ہیں''

مس سوال نامہ: ''سر ابھی تک میرے ذہن میں یہی سوال اٹکا ہوا ہے کہ گھر بنانا بھی چاہیے چاہے صفروں کے ساتھ ہی سہی یا پھر پہلا گھر بنانے میں کوئی ایسی غلطی ہوئی جس کا خمیازہ اب تک ہم بھگت رہے ہیں!''

زمان: ''سر آخر ہماری پوری کلاس سوال نامہ کو بھی تو بھگت رہی ہے (کلاس ہنستی ہے) دیکھا جائے تو یہ کنٹالو، کاسٹ گھر ہوتا ہے جس پر چند صفریں ہی خرچ ہوتی ہیں''

پروفیسر: ''اُن لوگوں سے زیادہ نادان کون ہو سکتا ہے جو صفروں کو جوڑ کر گھر بناتے ہیں اور اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے اتنے بہت سے گھر بنا لئے ہیں''

زمان: ''سر اس میں تو جیتا بھی وہی ہے جس کے سب سے زیادہ گھر ہوں اس لئے ابھی جو بات

ہو رہی تھی ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی یہ تو بات وہیں جا رہی ہے'' (کلاس ہنستی ہے)

پروفیسر: ''یہ بات مجھے اچھی تو نہیں لگی کہ میں آپ لوگوں کو پڑھا رہا ہوں اور آپ میں سے کچھ لوگ اپنی کاپیاں کھول کر بچوں والے کھیل میں مصروف ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ سب ابھی تک کسی نرسری کلاس میں پڑھ رہے ہیں اور ذہنی طور پر بلوغت کو نہیں پہنچے، (اتنے میں کسی کا موبائل فون بجنا شروع ہوتا ہے) کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ کلاس میں داخل ہوتے وقت موبائل فون بند کر دینا چاہیے مگر آپ لوگوں پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا''

زمان: ''سر بعض اوقات بہت اہم پیغام آنا ہوتا ہے یا آسکتا ہے اس طرح ایک رابطے کا سہارا سا رہتا ہے''

پروفیسر: ''او بے سہارا آدمی اصل میں ہر طرف غیر یقینی کی دھند چھائی ہوئی ہے ایسے میں ہر ایک کسی خبر کا منتظر ہوتا ہے کسی آواز کا انتظار کرتا ہے کسی ایسے پیغام کی آس رکھتا ہے جو ابھی خلاؤں میں لکھا جا رہا ہوتا ہے''

روبی: ''سر خلا میں تو لکھنا ہی ممکن نہیں'' (کلاس ہنستی ہے)

پروفیسر: ''آپ نے پھر خلانوردوں کو مخصوص طریقے سے پیغام لکھتے نہیں دیکھا''

زمان: ''سر ضروری تو نہیں کہ ان کے لئے خلا سے ہی پیغام آئے آخر زمین زاد کہاں جائیں گے''

پروفیسر: ''دیکھو میں یہ چاہتا تھا کہ جدید شاعروں کے پڑھنے اور پڑھانے سے پہلے آپ کو بتایا جا سکتا کہ جدیدیت کیا ہے، کیا اس کا تعلق زمانے کے ساتھ ہے یا طرزِ احساس یا رویے کے ساتھ اور پھر یہ کہ سماج کی صورتحال کا ذکر کرنے سے پہلے سماج کی بنیادی اکائی یعنی گھر میں موجود رشتوں کی سماجی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور دیکھا جائے کہ ہماری رسمی زندگی اور رسمی تعلق کسی حد تک ہمیں ایک دوسرے سے وابستہ رکھے ہوئے ہے یا ہم سب ایک طرح کی ریاکاری کی زندگی بسر کر رہے ہیں''

زمان: ''سر کبھی کبھی اس موضوع پر بات کرتے ہوئے آپ کا لہجہ بہت تلخ ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ آپ.....''

پروفیسر: (جلدی سے) ''براہ کرم میرے سکھائے ہوئے اصولوں سے میری ہی تحلیلِ نفسی نہ کریں اسے خود پر اپنے قریب کے لوگوں پر پہلے آزمائیں نتائج کا جائزہ لیں اور پھر بیشک استادوں تک بھی پہنچیں۔''

مس سوال نامہ: ''سر یہ جو زمان نے کہا ہے کہ آپ کا لہجہ بعض اوقات شادی کے ادارے کے بارے میں تلخ ہو جاتا ہے تو اس کا کوئی ذاتی سبب ہے؟''

پروفیسر: ''دیکھو بھئی بہتر ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی نجی زندگی کا احترام کریں، لوگوں کے ذاتی گوشوں میں نہ جھانکتے پھریں۔''

روبی: ''سر لٹریچر میں تو سارے معنی ممنوعہ سمتوں اور راستوں پر چلنے سے کھلتے ہیں اس لیے جتنی

ممانعت ہوتی ہے اُس سے زیادہ ترغیب پیدا ہوتی ہے۔''

پروفیسر: ''بھئی مجھے اب آپ کا داخلہ فارم نکال کر آپ کی ڈیٹ آف برتھ چیک کرنی پڑے گی آپ بڑی تیزی سے میچور ہو رہی ہیں اور آپ کے تبصرے مجھے خواہ مخواہ بیک فٹ پر لیے جا رہے ہیں۔''

(اب موبائل کی گھنٹی کی بجائے الارم بجنا شروع ہوتا ہے جس پر ایک دو طالب علم ہنستے ہیں جبکہ ایک دو سرگوشیاں ابھرتی ہیں)

پروفیسر: ''اب الارم کی باری ہے اس کے بعد کیا ہوگا ہر شخص جانتا ہے کہ الارم کے بعد کیسی بھگدڑ مچتی ہے''

روبی: ''سر اصل میں ڈاکٹر شیخ صاحب کی کلاس آپ کے بعد ہوتی ہے مگر آپ اپنی دھن میں پڑھاتے رہتے ہیں اور وہ باہر کھڑے پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں''

پروفیسر: ''گویا یہ الارم فرمائشی ہے اور یاد رکھو فرمائشیں پوری کرنے والوں کی زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں مگر فرمائشیں کرنے والے نہیں تھکتے چلیں آج آپ لوگوں سے تھوڑی بہت گفتگو ہو گئی مگر یہ صفروں والے گھر کا سوال میں آپ کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔''

مس سوال نامہ: ''تو سر مطلب یہ ہوا کہ آپ کے جانے کے بعد باقی بھی اپنی اپنی نوٹ بکیں کھولیں اور ساتھ ہی ایک ایک کلاس فیلو کا انتخاب کر کے صفروں والے گھر بنانا شروع کر دیں۔''

زمان: ''مس سوال نامہ پلیز ڈونٹ بی پرسنل۔''

روبی: ''سر اٹینڈنٹس پلیز۔''

پروفیسر: ''وہ پھر ڈاکٹر شیخ صاحب کے پروفارمے کی نقل کر لیں گے۔''

(۲)

(روبی اور زمان کی رومانوی ملاقات، شام کا وقت، کوئی پارک کا گوشہ، کبھی کبھار موٹر سائیکل کی آواز، ایک دو بچوں کی بے ساختہ آوازیں، کبھی کبھار کسی خوانچے والے کی صدا، ایک آدھ پرندے کی آواز)

روبی: ''بھئی زمان، میں جو بات کروں اپنی امی ابو سے، مجھے اس کا کتنا ثواب ہوگا؟ کیا فائدہ ہوگا مجھے آخر؟''

زمان: ''روبی پلیز بی سیریس، یہ میری زندگی کا سوال ہے، دیکھو روبی شیخ بن کر مجھ سے بات نہ کرو، نفع، نقصان کا کیا سوال؟''

روبی: ''تم اس بات پر روشنی ڈالو۔۔۔''

زمان: (بات کاٹ کر) ''سمسٹر سسٹم کے تحت ہونے والے امتحانوں، سوالناموں اور اس کے اُسلوب نے محبت کے نصاب اور انداز کو بھی بدل ڈالا ہے، اب ہر بات پر روشنی ڈالو، تنقیدی جائزہ لو، مختصر نوٹ لکھو، یار خدا کے لیے بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

روبی: ''تم اس اندھیرے میں روشنی کیوں نہیں ڈالتے؟''

زمان: ''ساغر صدیقی سنانا شروع کردوں، ع چراغِ طور جلاؤ، بڑا اندھیرا ہے۔ دیکھو میں نے تو بس اتنی بات کی تھی کہ تم ان سے بات کرلو، پھر میں ابا جی کو بھیجوں گا، ان کو ذرا warm reception چاہیے ہوتا ہے، ایسے موقعوں پر۔''

روبی: ''کیسے موقعوں پر؟ کتنی دفعہ وہ تمہارا پیغام لے کر مختلف گھروں میں جا چکے ہیں؟''

زمان: ''اوہ نہیں، خدا کے لیے نہیں! میرا مطلب تھا کہ ذرا تقریباتی موقعوں پر ان کی توقعات بڑھ جاتی ہیں۔''

روبی: ''جب ابھی کچھ طے ہی نہیں ہوا تو پھر ان کے آنے سے ہمارے گھر میں تقریباتی موقع کیسے پیدا ہو جائے گا؟''

زمان: ''تنقید کے پرچے نے تمہیں 'جج' بنا دیا ہے، پلیز، میری حالت تو دیکھو۔''

روبی: ''اپنی حالت دکھانی تھی تو دن کے وقت دکھاتے۔ پھر روشنی میں جہاں لوگ بیٹھے ہیں، وہاں بیٹھتے۔''

زمان: ''روبی، جیسے میں تمہیں چاہتا ہوں، تم بھی ویسے چاہتی ہو، مجھے؟''

روبی: ''نہیں۔''

زمان: (مایوس ہو کر) ''اچھا! آؤ چلیں۔''

روبی: ''اب چائے کا بل مجھے دینا ہوگا؟''

زمان: ''فضول باتیں مت کرو، میں ایسا بھی نہیں۔''

روبی: ''اب مجھے کچھ کچھ اندھیرے میں بھی نظر آنے لگا ہے، حتیٰ کہ تمہارا لٹکا ہوا منہ بھی۔''

زمان: ''ابھی کہو گی کہ یہ منہ کسی درخت کے ساتھ لٹکا ہوا ہے۔''

روبی: ''ابھی تو نہیں، البتہ میری اماں کو غصہ آ گیا تو یوں ہو بھی سکتا ہے۔''

زمان: ''تمہاری اماں، تم سے بھی زیادہ غصہ والی ہیں؟''

روبی: ''میں غصے والی ہوں، ساری کلاس میں سب سے زیادہ ہنس مکھ میں ہوں اور برداشت کی بڑی قوت ہے مجھ میں، میرا خیال ہے کہ میں شادی کے بعد تمہیں برداشت کرلوں گی، کافی حد تک۔''

زمان: (خوش ہو کر) ''شادی کے بعد؟ کیا تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟''

روبی: ''پوری بات تو سنتے نہیں ہو، میں کہہ رہی تھی کہ میری کہیں بھی شادی ہو گئی اور اپنے شوہر کے ساتھ تمہارا کبھی سامنا ہو گیا تو میں تمہارا دیکھنا برداشت کرلوں گی۔''

زمان: ''واہ کیا قوتِ برداشت ہے! اور اگر اس موقع پر میری قوتِ برداشت جواب دے گئی تو؟''

روبی: ''کافی فلمی سچوایشن ہو جائے گی، مگر اس وقت کوئی پیانو نہیں ہوگا جو تم بجا کر کوئی المیہ گیت گا سکو۔''

زمان: ''بدشگونی کی باتیں مت کرو، سنجیدگی سے میرے ایک دو بول سن لو۔''

روبی: ''شعر سنانے ہیں؟ یا بول پڑھوانے کی نیت سے بول سنانے ہیں؟''

زمان: ''لٹریچر، انسان کو زندگی سے دُور کر دیتا ہے، یہاں دل کا سفینہ ڈوب رہا ہے، تمہیں ضلع جگت کی پڑی ہے۔'' (زمان کا موبائل بجتا ہے، جسے وہ جلدی سے بند کرتا ہے)

روبی: ''سعدیہ کی کال ہوگی، سن لو اس غریب کی بات بھی، تم نے اسے ویٹنگ لسٹ میں نمبر ایک پر رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے، پلیز وضاحتیں پیش نہ کرو۔''

زمان: ''تم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں، بہت کم ہوا ہے کہ خوب صورتی اور ذہانت اکٹھے ہو جائیں، مگر یقین کرو روبی تمہاری ذات میں یہ دونوں یکجا ہو گئے ہیں۔''

روبی: ''تمہارے قصیدوں پر مجھے ہمیشہ سے یقین ہے، مدح ہو چکی اب گریز کے بعد حسنِ طلب کی طرف آؤ۔''

زمان: ''تم میرے ہر سوال کا براہِ راست جواب کیوں نہیں دیتیں؟''

روبی: ''تم نے جو تجویز پیش کی ہے، اس کے نفسیاتی، معاشی اور ثقافتی اثرات پر روشنی ڈالو۔''

زمان: ''پرچہ حل کرنے کا وقت کتنا ہے؟''

روبی: ''میرے پاس اب پانچ منٹ ہیں۔''

زمان: ''میں نے کہا تھا کہ تم میں بات کرنے کی زیادہ جرأت ہے، پھر تمہاری اپنے والدین سے ذہنی اور جذباتی قربت ہے، تم بڑی آسانی سے اپنی بہتر زندگی کا آپشن ان سے ڈسکس کر سکتی ہو۔''

روبی: ''اوئے زمان، تم کبھی کبھی لازمان ہو جاتے ہو، یہ 'بہتر زندگی' کیسے یقین سے منہ بھر کے تم نے کہہ دیا، شادی کے بعد اکثر لوگوں کی زندگی بدتر ہو جاتی ہے۔''

زمان: ''ہم دونوں کی محبت، ہر قسم کی آزمائش پر پوری اترے گی، ہم دونوں ہر مشکل کا سامنا کریں گے۔''

روبی: ''تم دنیا جہان کے مردوں میں انارکلیوں کو دیواروں میں چنوانے کا شوق کیوں ہے؟ بدنام بیچارے مہابلی ہوتے ہیں، نظام چلانے والے۔ حالانکہ محبت مسلط کرنے والے، کسی جیتی جاگتی عورت کو ملکیت میں لے کر انتقال اپنے نام چڑھانے والے، ایک اور نو آبادی پر استعماری نظر ڈالنے والے معصوم بن جاتے ہیں، ایک دم معصوم۔''

(بیرا آتا ہے، ''چائے لے آؤں اور جی'')

روبی: ''بس بل لے آؤ، ہم چلتے ہیں''، (روبی کا موبائل بجتا ہے، اس کی گھنٹی کی آواز زمان کے موبائل سے مختلف ہے)

زمان: ''سن لو، میں کسی کا نام نہیں لوں گا اور نہ کسی ویٹنگ لسٹ کا ذکر کروں گا، آں ہاں، منہ بند کر دیا، اس غریب کا بھی گلا دبا دیا، تم نے؟''

روبی: ''دیکھو زمان، تم بہت سوں سے اچھے ہو، میں تم پر اعتماد بھی کرتی ہوں، اسی لیے یہاں ہوں،

مگر شادی۔۔۔''

زمان: ''پلیز، اب پروفیسر فارغ البال کے لیکچر کوری پروڈیوس نہ کرنا۔''

روبی: ''میں کسی کے لفظ دہرانے کی عادی نہیں، میں آنکھیں کان کھلے رکھتی ہوں، اور پھر (اداس ہو کر) میرے اپنے گھر میں۔۔۔ایسا بہت کچھ ہوا ہے، ہو رہا ہے، جس کے بعد میں سمجھتی ہوں کہ شادی آخر کار محبت کرنے والوں کے بیچ دیوار بن جاتی ہے، جو انہیں اجنبی بنا دیتی ہے۔''

زمان: ''پہلے صرف ایک دیوار کی بات ہوتی تھی، ظالم سماج کی دیوار، اب ہم خود اپنی بدگمانیوں اور اندیشوں سے دیواریں اُٹھاتے جاتے ہیں اپنے بیچ، ان ہاتوں سے، جو محبت کے زور میں ہر دیوار کو گرا سکتے ہیں۔''

روبی: ''دیکھو، اب بھی سوچ لو کہ میری جیسی لڑکی کے ساتھ شادی کے بعد تم خوش نہیں رہ سکو گے، میں سوچ سکتی ہوں، بول سکتی ہوں اور صرف سہہ نہیں سکتی، وار بھی کر سکتی ہوں۔''

زمان: ''میں تم سے، تمہاری تمام صلاحیتوں سے پیار کرتا ہوں، تین سمسٹر تمہارے وار سہتے گزار دیئے، بتاؤ، کبھی اُف کی؟ کبھی 'روند ماری' تمہاری طرح؟ کبھی منہ بنایا، ایک قدم پیچھے ہٹایا، روبی، تمہارے نین نقش تمہارے لفظ، تمہارے میٹھے نشتر میری آنے والی زندگی کے خاکے کو رنگین بنا دیتے ہیں، پلیز اب میری بات پر ہنس نہ پڑنا، میں تمہارے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا۔''

روبی: ''ابھی کئی پل میرے بغیر تمہیں گزارنے ہیں، میں اپنے ابو سے بات کروں گی، پھر تمہیں بتاؤں گی کہ اپنے ابا جی کو کب ہمارے گھر بھیجو۔''

زمان: ''پلیز اب مجھے بل دینے دو۔''

روبی: ''میں اتنا چھوٹا بل تمہیں نہیں دینے دوں گی۔'' (دونوں ہنستے ہیں)

(۳)

(روبی کا گھر، اس کے ماں باپ آپس میں الجھے ہیں)

ماں: ''میرے کمرے کی آج تم نے پھر تلاشی لی تھی، میں پوچھتی ہوں تم نے پھر تلاشی لی تھی؟''

(باپ ریڈیو پر موسیقی سن رہا ہے، ماں اسے بند کرتی ہے) ''میں پوچھ رہی ہوں، تم سے کچھ؟''

باپ: ''تم سوال نہیں کر رہی، تفتیش کر رہی ہو، اچھے سُروں میں کڈھب، بے تال بے سُری چیزیں ملانے کا شوق تمہیں اب کا تو نہیں۔''

ماں: ''وہاں ہے کیا، جو تم تلاش کرتے رہتے ہو، میری الماری کے کپڑے اور اخباروں کے کاغذ پھر ہلے پڑے ہیں۔''

باپ: ''تمہیں تو پتا ہے کہ میری گم شدہ محبت ہے، وہاں، جب کبھی پرانے دنوں کی یاد آتی ہے، میں

بے اختیار ادھر چل پڑتا ہوں۔''

ماں: ''اس طرح کے ڈائیلاگ تم اپنے دفتر والیوں کے سامنے بولا کرو، وہ وقت گزر چکا، جب تم ریہرسل مجھ پر کرتے تھے، پرفارم کہیں اور کرتے تھے، میں تمہارے اندر باہر کی ساری کالک سے واقف ہو چکی ہوں۔''

باپ: ''شرم کرو، اپنے مجازی خدا کی کالک کا ذکر کر رہی ہو، تہمتیں اور الزام لگا رہی ہو، یاد رکھو، اس سب کا انجام اچھا نہ ہوگا۔''

ماں: ''اب کس انجام کی دھمکی دے رہے ہو، میں تو بیس سال سے کہہ رہی ہوں کہ اس بے تعلقی کو علیحدگی میں بدل لو، مگر تمہیں دنیا والوں سے ڈر لگتا ہے جو تمہیں پارسا سمجھتے ہیں، ایک مثالی آدمی خیال کرتے ہیں۔''

باپ: ''ہم ایک عرصے سے علیحدگی کی زندگی تو بسر کر رہے ہیں، اپنے کمرے میں رکھے ٹی وی پر تم چینل بھی اور دیکھتی ہو، برتن، چولھا، ہانڈی بھی الگ کر لیا ہے تم نے، علیحدگی اور کیا ہوتی ہے؟''

ماں: ''روبی کی شادی ہونے تک تم نے کہا تھا کہ ہم ایک چھت تلے زندگی بسر کر لیں، ورنہ ہم تو اب ایک پل بھی برداشت نہ کر سکیں ایک دوسرے کو، مجھے بتاؤ میرے کمرے میں کیا ڈھونڈنے گئے تھے تم؟''

باپ: ''میں نے تو کہا کہ میں اپنی گم شدہ محبت، اپنے پرانے خط، آنسوؤں سے بھیگے ہوئے رومال اور تکیے تلاش کرنے گیا تھا۔''

ماں: 'مجھے پتا ہے کہ تم مکان کے کاغذوں اور میری چیک بک کے پیچھے ہو، تم آسانی سے وہ ہتھیا نہیں سکتے، ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ میں نے اپنے specimen signatures بدل دیئے ہیں، بینک کو نیا فارم بھر کے دے دیا ہے، وہ دستخط جو تم کر لیتے تھے میرے وہ بدل دیئے ہیں میں نے۔''

باپ: ''روبی کی ماں، مجھے اتنا نیچ سمجھتی ہو؟''

ماں: ''نیچ؟ یہ بیچارا لفظ تو شرمندہ ہوتا ہے، تمہارے سامنے، تمہاری جیبوں سے بریف کیسوں سے جو جو کچھ پیکٹوں کی شکل میں ملتا ہے، وہ میں نے تمہاری بیٹی کو بھی دکھایا ہے اور تمہاری بہنوں کو بھی۔''

باپ: ''نان سینس! وہ تو میرے دفتر کے ایک ساتھی کو ایسی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مجھ سے منگواتا رہتا ہے۔''

ماں: ''میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں، تمہارے کالے جھوٹوں اور کرتوتوں کی ساری خبر ہے، میں تو اب جی رہی ہوں، اس امید پر کہ تمہیں اپنے کیے کی سزا ملے۔''

باپ: ''میں جانتا ہوں ایک عرصے سے تمہارے دل میں خواہش ہے میری بیوہ کہلانے کی، اس لیے میں نے سیر کرنی شروع کر دی ہے، کولیسٹرول بڑھانے والی چیزیں کم کر دی ہیں، خوراک میں، سالانہ چیک اپ کی بجائے سہ ماہی کراتا ہوں۔''

ماں: ''یاد رکھو، میں بھی سادہ غذا اور عبادت گزاری کی طرف اس لیے آئی ہوں کہ تمہیں رنڈوے ہونے کا موقع نہ دوں، میں نے اپنے محکمے اور بینک کو بھی لکھوا دیا ہے کہ اچانک ایک دن میں مر جاؤں تو ایف آئی آر کس کے نام کٹوانی ہے؟''

باپ: ''آج سے پینتیس سال پہلے تم اتنی ظالم نہ تھیں، ہمیں دعائیں دو کہ تمہیں قاتل اور ظالم بنا دیا۔''

ماں: ''مصنوعی دانتوں کے ساتھ، ایسے چونچلے نہ کیا کرو۔''

باپ: ''تمہیں تو پتا ہے کہ میں نے حق مہر میں تمہیں پوری بتیسی لکھ دی تھی، آدھی معجّل، آدھی غیر معجّل۔''

ماں: ''حق مہر میں تم نے صرف ہاتھی کے دانت لکھے تھے، دکھانے والے۔''

باپ: ''میرا خیال ہے ہم دونوں برس ہا برس کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ایک ہی اُسلوب میں کمیونیکیٹ کر سکتے ہیں اس لیے ہم چاہیں تو جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا وہاں سے جوڑ سکتے ہیں۔''

ماں: ''تم جانتے ہو کہ یہ سلسلہ تمہارے جھوٹ بولنے سے اور متواتر جھوٹ بولنے سے ٹوٹا ہے اور ہمیشہ کے لیے ٹوٹا ہے۔''

باپ: ''زندگی میں ہر شے اتنی قطعی اور آخری نہیں ہوتی ورنہ اسے گزارنا بہت مشکل ہو جائے۔ ہم نے اپنی روبی کی خاطر زندگی میں کچھ سمجھوتے بھی تو کیے ہیں اور اب بھی اُسی کی خوشی کی خاطر ہمیں چند باتیں طے کرنی ہیں۔''

ماں: ''کیا طے کرنا ہے؟''

باپ: ''روبی نے اپنے ایک کلاس فیلو سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔''

ماں: ''اُس نے تم سے بات کی ہے؟''

باپ: ''ہاں۔''

ماں: ''مجھ سے کیوں نہیں کی؟''

باپ: ''میرے خیال میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

ماں: ''فرق کیوں نہیں پڑتا؟''

باپ: ''دیکھو اس وقت اس مسئلے پر بحث نہ کرو۔''

ماں: ''کیوں نہ کروں؟ یہ بنیادی سوال ہے کہ آخر روبی نے تم سے ہی بات کیوں کی؟ اور اگر وہ اپنی ماں کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ مجھے بھی وہ سب کچھ بتاتی جو تمہارے ساتھ شیئر کیا ہے تو پھر اب میں اس مشورے میں کس طرح شامل ہو جاؤں؟''

باپ: ''پلیز اس وقت کوئی اور سوال کھڑا مت کرو۔ لڑکا اچھے گھر کا ہے، محنتی ہے اور کسی حد تک سیلف میڈ ہے۔ ٹیوشنیں پڑھا کر اپنی یونیورسٹی کی فیس دیتا رہا ہے۔''

ماں: ''سیلف میڈ؟ تمہاری طرح کا سیلف میڈ۔ اس سے زیادہ نفسیاتی طور پر قابلِ رحم کردار کوئی نہیں ہوتا۔ مقروض، ممنون، ٹیڑھا میڑھا، اُلٹا سیدھا ___ ہونہہ ___ سیلف میڈ۔''

باپ: ''دیکھو ماں باپ کی وراثتوں پر پلنے والی اولادیں اکثر آرام طلب ہوتی ہیں اور اُن میں بگاڑ کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔''

ماں: (طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے) ''ارے امین صاحب آپ کو تو وراثت میں کچھ نہیں ملا تھا پھر آپ کیوں بگڑے؟ اور کچھ خبر بھی ہے کہ کب بگڑے اور کس کس کی خاطر بگڑے؟''

باپ: ''وہ لوگ آئندہ اتوار کو ہمارے گھر آئیں گے۔''

ماں: ''گھر کا مطلب تمہیں پتا ہے؟''

باپ: ''پلیز تین چار ہفتوں کے لیے سیز فائر کر لو۔ یہ صحیح ہے کہ تمہارے اندر اسلحہ ساز فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں۔ تمہارے پاس گولہ بارود کی کبھی کمی نہیں ہو سکتی۔ نشانے بھی تو ٹھیک ٹھیک لگاتی ہو مگر زندگی بھر کے لیے ایک ہی ہدف ایک ہی تختۂ مشق کافی ہے۔''

ماں: ''جب تک میں روبی کے ساتھ بات نہ کر لوں اُس وقت تک میں نہیں جانتی کہ میں ایسی ملاقات میں بیٹھوں گی بھی سہی کہ نہیں۔''

باپ: ''وہ کیا سوچیں گے؟''

ماں: ''زیادہ اچھا ہے کہ ہمارے گھر کے حالات سے وہ جلدی واقف ہو جائیں۔''

باپ: ''کبھی تو اپنی ذات سے ہٹ کے کسی اور کے بارے میں بھی سوچ لیا کرو۔ بہت تم نے من چاہی کر لی۔ اب پلیز میرے صبر کو زیادہ نہ آزماؤ۔'' (روبی کمرے میں داخل ہوتی ہے)

روبی: ''ویری گڈ ہیپی ری یونین۔ کیا سازشیں ہو رہی ہیں؟''

ماں: ''روبی تم میرے کمرے میں آؤ میں نے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

باپ: ''زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم سب اکٹھے بیٹھ کے اس موضوع پر گفتگو کر لیں۔''

ماں: (طنزیہ انداز میں) ''اکٹھے بیٹھ کے؟ اب تو یہ منافقت چھوڑ دو تمہیں کیا ضرورت ہے اس گھر کے لوگوں کو اکٹھا بٹھانے کی، جوڑنے کی، ساری عمر تم نے توڑنے کی کوشش کی، اس لڑکی کے معصوم ذہن میں بھی یہ ڈالنے کی کوشش کی کہ اُس کی ماں ایک چڑیل ہے جادوگرنی ہے، سارے گھر کی دشمن ہے، تم اس کو کہانیاں سناتے رہے کہ ایک لڑکی اپنی سوتیلی ماں کو زہر کا ٹیکا لگانے کی خاطر ڈاکٹر بنتی ہے۔''

باپ: ''اچھا اسی لیے تم نے روبی کے ڈاکٹر بننے کی مخالفت کی تھی۔ بیٹھو تو سہی پلیز ایک منٹ کے

لیے۔ اچھا روبی تم ہی اس کے کمرے میں چلی جاؤ۔''

(۴)

(زمان کا باپ جو دنیاوی اعتبار سے ایک کامیاب شخص ہے ہر چیز کو ناپنا اور تولنا جانتا ہے اور ایک کے چار بنانے کا ہنر رکھتا ہے)

شیخ صاحب: (فون پر) ''ارے بھائی وہ پراپرٹی کا ریٹ پچھلے ہفتے کا تھا اب تو زلزلے کے بعد وہ سارے جو پہاڑیوں کی پہاڑیاں الاٹ کرا رہے تھے غائب ہو گئے ہیں، اس لئے میری مانو تو صرف خیموں کا کاروبار کرلو اور میں نے کہا نا اس وقت ہر کوئی اپنی نوکری پکی کر رہا ہے تمہارے بیٹے کو کون دے گا۔ تم بھیا تین چار سال کیلئے صبر کرلو ارے صبر کوئی ہفتے دو ہفتے کا ہوتا ہے بابا یہ لمبی مدت کے لئے ہوتا ہے اور دیکھو باقی باتیں ملیں گے تو کریں گے، خدا حافظ ارے بھائی ایک لیڈی بیٹھی ہیں میرے پاس تم فون کو لمبا کیے جا رہے ہو ٹھیک ہے ٹھیک ہے (فون بند کرتا ہے) جی آپ فرمائیے''

مس سوال نامہ: ''میں اپنے شہر کے کامیاب لوگوں پر ریسرچ کر رہی ہوں کہ اُن کی کامیابی کا راز کیا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ نے بہت بڑا مقام اس شہر کی سماجی زندگی میں پیدا کیا ہے اور ماشا اللہ اب آپ اور تیزی سے ترقی کے زینے طے کر رہے ہیں تو شیخ صاحب کچھ آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی اس خوشحالی اور ترقی کا راز کیا ہے''

شیخ صاحب: ''دیکھیں جی ہم تو مزدور لوگ ہیں سارا دن محنت مزدوری کرتے ہیں سفید پوش آدمی ہیں بڑی مشکل سے بچوں کو تعلیم دلوا رہے ہیں اور جی بس جینے کا بھرم رکھ رہے ہیں ہم، اگر آپ اس کو کامیابی کہتے ہو تو (مضحکہ خیز ہنسی ہنستے ہوئے) تو بھئی ہم کامیاب ہی ہونگے لیکن ہماری نظر میں ابھی کامیابی کئی پلاٹ کئی پلازے اور کئی پرمٹ دُور ہے۔''

مس سوال نامہ: ''شیخ صاحب آپ نے اب تک جتنی پھرتی سے مرحلے طے کیے ہیں، یہ رکاوٹیں کوئی خاص رکاوٹیں نہیں ہیں۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ لوگ آپ کو سورج مکھی کیوں کہتے ہیں؟''

شیخ صاحب: ''لوگ تو مجھے جن ناموں سے یاد کرتے ہیں وہ کافی غیر مہذب ہیں مگر سورج مکھی کا نام تو میں نے اپنے آپ کو دیا ہے، وہ سمجھدار اور ہوشیار پھول سارے چمن میں سب سے باخبر پھول جو اپنا منہ ہمیشہ سورج کی طرف رکھتا ہے، جانتا ہے کہ اختیار اور اقتدار سب سورج کے پاس ہے، اُس کے اپنے سارے رنگ اور جوبن سورج کا دیا ہوا ہے اس لیے یہ ہمیشہ اپنا منہ سورج کی طرف رکھتا ہے۔ یہ اپنے محسن کو پہچاننے والی بات بھی ہے جو کہ ہمارے ہاں ختم ہوتی جا رہی ہے۔''

مس سوال نامہ: ''شیخ صاحب آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کافی خست پسند یا کنجوس ہیں، کیا یہ

بات درست ہے؟''

شیخ صاحب: ''دیکھئے آپ مجھے کفایت شعار کہہ سکتی ہیں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ میں نے کتنی محنت سے حاصل کیا ہے اس لیے میں نے تو اپنی اولاد کی بھی تربیت اسی طرح سے کی ہے کہ وہ سولہ آنسو بہاتے تھے تو میں ایک چونی دیتا تھا۔ وہ پندرہ سوال کرتے تھے تو میں ایک روپیہ دیتا تھا۔''

مس سوال نامہ: ''میرا ابھی تو تیسرا سوال ہے گویا مجھے بارہ سوال اور کرنے ہیں۔''

شیخ صاحب: ''اگر آپ آسان آسان سوال کریں تو میں آپ کے ہر سوال کے عوض پانچ روپے بھی دینے کے لیے تیار ہوں۔''

مس سوال نامہ: ''شیخ صاحب کہا جاتا ہے کہ آپ ترقی کی خاطر رشوت دینے کو بھی بُرا نہیں خیال کرتے۔ کیا یہ بات درست ہے؟''

شیخ صاحب: ''دیکھئے ہم نے چیزوں کے بھیانک نام رکھ چھوڑے ہیں۔ کسی کو ہم لوٹا کہتے ہیں، کسی کو رشوت دینے والا، کسی کو خسیس، جب کہ آپ ترقی کی منزلیں طے کر ہی نہیں سکتے جب تک آپ میں اختیار والوں کو خوش کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور پھر آپس میں تحفے تحائف دینے سے تو محبت بڑھتی ہے۔ یہ ہدیہ یا تحفہ رشوت کس طرح سے ہو گیا؟''

مس سوال نامہ: ''ہر اخبار میں آپ کی تصویریں چھپتی ہیں اور کبھی کبھار آپ کی طرف سے قومی مسائل پر اخبارات میں اظہارِ خیال مضامین کی صورت میں بھی ہوتا ہے جب کہ آپ کی باقاعدہ تعلیم کے بارے میں آپ کے کچھ مخالف عجیب و غریب باتیں سناتے ہیں۔''

شیخ صاحب: ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے ملنے سے پہلے آپ کو میرے مخالفوں سے ملنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی حالاں کہ میں تو ایک ایسا شخص ہوں جس کی زندگی کھلی کتاب ہے۔ یہ اور بات کہ میں اس کتاب میں سے کسی کو بلیڈ یا قینچی مار کر کوئی صفحہ کوئی تصویر نکالنے نہیں دیتا۔''

مس سوال نامہ: ''آپ تو شیخ صاحب کافی ادبی زبان استعمال کرتے ہیں، یہ سب کیسے ہوا؟''

شیخ صاحب: ''بس جی، میری ایک بلڈنگ میں ایک شاعر کرایہ دار ہیں، وہ ہر تین ماہ کے بعد کرائے میں مہلت کے لیے عرضیاں لکھتے ہیں، ان میں سے چند لفظ اور جملے چُن کر میں قومی اہمیت کے موضوعات پر مضمون لکھ دیتا ہوں جی۔'' (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، شیخ صاحب فون پر سیکریٹری کو ہدایات دیتے ہیں ''دس منٹ تک کوئی فون نہ ملانا'' پھر موبائل بجتا ہے تو شیخ صاحب کہتے ہیں ''انٹرویو ہو رہا ہے جی۔'')

مس سوال نامہ: ''اچھا تو جناب میں مسز شیخ کا بھی انٹرویو لے سکتی ہوں؟''

شیخ صاحب: ''دیکھیں جی میں انصاف پسند ہوں، میں نے تین شادیاں کیں، ہر ایک میں اپنا نام بانٹ دیا، ایک مسز 'ش' کہلاتی ہیں، ایک مسز 'ی' اور تیسری مسز 'خ'، آپ کس کس سے انٹرویو کرتی پھریں گی، جو کچھ پوچھنا ہے مجھ سے ہی پوچھیں۔''

مس سوال نامہ: ''شیخ صاحب، آپ کے کتنے بچے ہیں؟''

شیخ صاحب: ''تین تین ہر گھر میں ہیں۔''

مس سوال نامہ: ''ان سب کی تعلیم و تربیت پر کافی اخراجات کرنے پڑتے ہوں گے، ہیں جی؟''

شیخ صاحب: ''اصل میں پہلی شادی تو میں نے بے دھیانی میں کر لی تھی، باقی دونوں بیگمات کے والدین کافی خوش حال ہیں، نواسے، نواسیاں ان کے ذمے ہیں۔''

مس سوال نامہ: ''وہ جی زمان بھی آپ کا بیٹا ہے ناں جی۔''

شیخ صاحب: ''جی، جی، ماشاءاللہ یونیورسٹی کے فائنل ایئر میں ہے، آپ کیسے جانتی ہیں جی؟''

مس سوال نامہ: ''مگر وہ تو کہتا ہے کہ میں اپنی فیس ٹیوشن پڑھا کر دیتا ہوں۔''

شیخ صاحب: ''ہاں جی ہاں جی، وہ مجھے ہی ٹیوشن پڑھاتا ہے۔''

مس سوال نامہ: ''وہ جی، وہ کچھ بے دھیانی میں ایک شادی کرنے کا خیال رکھتا ہے۔''

شیخ صاحب: ''وہ جی بیٹا میرا ہے، اتنا بھی بے دھیان نہیں ہوگا، اچھی نوکری دلانے والی سسرال ڈھونڈے گا۔''

مس سوال نامہ: ''وہ جی آپ کو اس بات کا افسوس نہیں ہوا کہ وہ اپنی مرضی سے شادی کر رہا ہے، ایک عام سی لڑکی ہے جی روبی، اس سے۔''

شیخ صاحب: ''میں تو خود عام خاص سکول میں پڑھتا رہا ہوں، مجھے پتا ہے کہ عام کب خاص ہو جاتا ہے اور خاص کیسے عام ہوتا ہے، ہیں جی۔''

مس سوال نامہ: ''میں نے کہا ناں کہ آپ کو اس کا دکھ نہیں کہ آپ کا بیٹا آپ سے پوچھے بغیر شادی کر رہا ہے۔''

شیخ صاحب: ''دیکھیں جی، ایک تو وہ اپنے ٹھکانے اور نوکری کا بندوبست کر رہا ہے، دوسرے اس طرح مجھے ولیمے کے خرچے سے بچا رہا ہے، میں اس پر افسوس کیوں کروں جی؟ یہ تو خوشی کی بات ہے اپنے لیے۔''

مس سوال نامہ: ''دولت اور ترقی نے آپ کو بے حس کر دیا ہے، آپ کیسے باپ ہیں؟ کیسے سربراہ ہیں کنبے کے؟''

شیخ صاحب: ''آپ میری بزرگ کے طور پر تشریف لائی ہیں یا انٹرویو لینے؟''

مس سوال نامہ: ''آپ مشین، روبوٹ، کمپیوٹر بن گئے ہیں، سارے دولت اور اختیارات کے پجاری آخر آخر میں ایسے ہو جاتے ہیں، آپ تو درمیان میں ہی ایسے ہو گئے ہیں۔''

شیخ صاحب: ''مجھے اس ملاقات کے شروع میں آپ کا نام پوچھنا چاہیے تھا، اب کوئی فائدہ نہیں جب آپ جانے والی ہیں، میں آپ کا نام پوچھوں؟''

مس سوال نامہ: ''ٹھیک ہے جی مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں چلی جاؤں، پر آپ عجیب قسم کے باپ ہیں جی۔''

شیخ صاحب: ''مجھے تو آپ خود کنفیوزڈ قسم کی خاتون لگتی ہیں، ریسرچ سکالر ہیں، انٹرویو لینا چاہتی ہیں، ساتھ ہی میرے گھر کی ذاتی قسم کی معلومات سے بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔''

(زمان داخل ہوتا ہے)

زمان: ''ابا جی میں نے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے، ارے مس سوال نامہ آپ یہاں؟''

مس سوال نامہ: ''زمان یہ آپ کے ابا جی ہیں؟''

زمان: ''یہی کچھ پوچھنے کے لیے آپ نے اتنی زحمت کی؟ وہیں یونیورسٹی میں پوچھ لیتے، میں ابا جی کی تصویر آپ کو دکھا دیتا۔''

شیخ صاحب: ''اچھا بھئی یہ یونیورسٹی نہیں میرا آفس ہے اب آپ دونوں تشریف لے جا سکتے ہیں۔''

(۵)

(رات کا وقت، روبی کی ماں کا دروازہ اندر سے بند ہے، ادھر سے ٹیلی فون بار بار بجتا ہے، اُٹھانے پر بند ہو جاتا ہے، ادھر ادھر آہٹیں، آندھی کا شور، روبی خوف زدہ ہے)

روبی: (دروازے پر دستک دیتے ہوئے) ''امی امی دروازہ کھولیں، میں روبی ہوں، امی میں نے آپ سے ضروری بات کرنی ہے، زمان کے بارے میں نہیں، امی پلیز دروازہ کھولیں، امی، (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، فون اُٹھاتی ہے) ہیلو، کون، کون، بولتے کیوں نہیں؟ میں پولیس کو رپورٹ کرتی ہوں (جواب میں ایک ڈرانے والی ہنسی) CLI پر یہ نمبر کیوں نہیں آ رہا؟ (ایک نمبر ملاتی ہے) ''آنٹی میں روبی بول رہی ہوں، انکل ہیں نہیں؟ ساہیوال گئے ہیں۔ نہیں اصل میں میں نے ان سے ایک بات کرنی تھی۔ نہیں نہیں بات تو کوئی خاص نہیں ایک کتاب ان سے منگوانی تھی، وہ ناں اصل میں آنٹی ابو ایک پارٹی میں گئے ہیں، آئی واز فیلنگ لونلی، نہیں نہیں آنٹی میں بہت بہادر ہوں، مجھے ڈر تو نہیں لگ رہا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں، کالونی والوں نے ایک گارڈ رکھا ہوا ہے، وہ باہر گلی میں گھوم رہا ہے، گن لے کر، نام؟ نام تو مجھے معلوم نہیں، ابو کو پتا ہوگا، یا انکل چشتی کو معلوم ہوگا، وہی لائے تھے اسکو، وہ آنٹی اب آپ ٹھیک ہیں؟ وہ جو زبان کٹ گئی تھی، ٹانکے کھل گئے ہیں؟ سوری آپ کو تکلیف دی'' (فون بند کرتی ہے) (باہر کسی کے گرنے کی آواز آتی ہے اور ایک کواڑ چرچراتا ہے) کون؟

میں پوچھتی ہوں، کون؟ ابو باہر کوئی ہے، آپ گن لے کر نکلیں پلیز، امی آپ 115 کو فون کریں'' (آندھی اور بارش تیز ہو جاتی ہے، لائٹ جاتی ہے) ''اوہ لائٹ چلی گئی، ہاں، سٹور کا یہ دروازہ، یہ والا، وہ پڑی ہوگی ادھر ایمرجنسی لائٹ، اوہ، یہ تو چارج ہی نہیں ہوئی، دیکھتی ہوں کچن میں موم بتی ہوگی، ٹارچ بھی تو تھی، کوئی چیز ٹھکانے سے نہیں ملتی، (دِلی زبان میں) یہ گھر بھی ایسی کشتی ہے جسکا کوئی ملاح نہیں، (باہر پھر کھٹکا ہوتا ہے) ابو ادھر دائیں طرف، پلیز، فائر پہلے نہ کریں، دیکھیں ہمیں کوئی مصیبت ہی نہ پڑ جائے (ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے) کیا مصیبت ہے؟ نہیں جی، یہ ہسپتال نہیں ہے، نہیں جی یہ ایمرجنسی وارڈ نہیں ہے، جی (فون بند کرتی ہے) (پھر جا کر ماں کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے) امی پلیز، دروازہ کھولیں، امی میں روبی ہوں، آپ روبی کو نہیں پہچانتیں؟ کسی کو بھی نہیں پہچانتیں؟ امی میں روبی ہوں'' (رونے لگتی ہے)

(ماں آہستہ سے دروازہ کھولتی ہے)

ماں: ''کیا بات ہے؟ اندر آ جاؤ'' (روبی روتی ہوئی لپٹ جاتی ہے)

ماں: ''کہاں ہے تمہارا باپ، جس سے تم باتیں کر رہی تھیں کہ گن اُٹھا لے۔ اب گن کی کسر رہ گئی ہے اس گھر میں؟''

روبی: (آہستگی سے) امی باہر کھٹکا تھا، میں نے کہا کہ اگر کوئی ہے تو یہ سن کر بھاگ جائے گا کہ ابو گھر میں ہیں اور ہمارے پاس گن بھی ہے''

ماں: ''واقف، اجنبی، گھر میں موجود، غیر موجود سب کو پتہ ہے کہ تمہارے باپ کو اس گھر کی، اس گھر میں رہنے والوں کی کوئی پروا نہیں، وہ تو صرف مجھے ہی پتا ہے کہ اس وقت وہ کہاں بیٹھا گل چھرے اُڑا رہا ہوگا''

روبی: ''امی، ڈونٹ بی کروال (Don't be Cruel) وہ بتا کر گئے تھے کہ ان کے آفس میں سالانہ ڈنر ہے''

ماں: ''گذشتہ ۲۴ سال سے ہر شام اسکے آفس کا سالانہ ڈنر ہوتا ہے، مجھ سے زیادہ کوئی واقف نہیں اسکی مکاریوں سے''

روبی: ''امی، پلیز ایسی زبان استعمال نہ کریں، ابو کے بارے میں، کسی کے بارے میں بھی آپ کی اپنی شخصیت میں ایک بڑی تبدیلی آ گئی ہے، ایسی زبان بول بول کے''

ماں: ''تمہیں بد دعا بھی نہیں دے سکتی، ورنہ کہتی کہ میرے جیسی زندگی بسر کرو پھر تمہیں معلوم ہو کہ پھول برسانے کی تمنا کرنے والی زبان خاردار کیوں ہو جاتی ہے؟ (باہر کھٹکا ہوتا ہے)

روبی: امی کافی دیر سے فون بھی بج رہا ہے، میں اُٹھاتی ہوں تو بند ہو جاتا ہے، ایک دفعہ تو ڈرانے والی

ہنسی کی آواز بھی سنائی دی تھی''

ماں: ''مرد کی آواز بھی؟''

روبی: ''آواز لگتی تو مرد کی تھی، مگر یہ بھی لگتا تھا کہ کوئی عورت ہے جو اپنی آواز کو مردانہ بنا کر بول رہی ہے، پر امی مجھے ڈر لگ رہا ہے، لائٹ بھی چلی گئی ہے، میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

ماں: ''فیصلے بڑے بڑے کرتی ہو، اور پھر بچوں کی طرح ڈرتی ہو، ابھی تو گھر میں ماں کے ساتھ ہو، جب ساس کے ساتھ ہوگی، نندوں کے ساتھ ہوگی، جو بعض اوقات سچ مچ جان کے دشمن ہو جاتے ہیں، تم کیا کرو گی؟''

روبی: ''امی پلیز، مجھے ڈرائیں نہیں'' (فون کی گھنٹی بجتی ہے)

ماں: ''ٹھہرو مجھے اُٹھانے دو، میں خود بات کرتی ہوں، (فون اُٹھاتی ہے) ہیلو، کون؟ کون ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟ خالد ہو؟ اوہ نہیں، اچھا روبی نے فون کیا تھا، نہیں نہیں ہم دونوں گھر میں ہیں، ڈرنے کی کیا بات ہے؟ ٹھیک ہے، اللہ حافظ!''

روبی: اوہ، شکر ہے لائٹ آ گئی، امی، اگلے اتوار کو زمان کے گھر سے لوگ ہمارے ہاں آئیں گے''

ماں: ''روبی، تم ویسے میری بات مانتی تو نہیں، بچپن سے ہی باپ کی مانتی آئی ہو، میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم وہاں شادی مت کرو، ساری عمر روؤ گی سر پکڑ کر''

روبی: ''امی، آپ پلیز ایک مرتبہ زمان سے مل لیں، وہ بہت کھلے ذہن کا صاف دل آدمی ہے، میرا خیال ہے امی کہ میں اس کے ساتھ خوش رہوں گی''

ماں: ''میں تمہارے باپ سے بھی ملی تھی، شادی سے پہلے، میں نے اسے بھی کھلے ذہن کا، صاف دل آدمی پایا تھا، بڑی میٹھی باتیں کرتا تھا، پھر ایک برس کے اندر ہی اسکے وہ لچھن اور کرتوت دیکھے کہ میرے سارے خوابوں میں زہر گھل گیا''

روبی: ''امی، آپ نے اتنے سال غصے اور اشتعال میں اکٹھے رہ کر کیسے گذار دیئے؟''

ماں: ''تم بھی ایک وجہ ہو، مگر میں نے اسکے لئے اپنے ماں باپ کو چھوڑا تھا، میری ماں مری، میرے باپ نے جنازے پر نہ آنے دیا، میرا باپ مرا، وصیت کر گیا کہ یہ جنازے پر بھی نہ آئے، جائیداد سے عاق کر دیا''

روبی: ''امی، دونوں ماموؤں نے بھی کبھی نہیں چاہا ہوگا کہ آپ کی اپنے ماں باپ سے صلح ہو، اس طرح انہیں جائیداد کا حصہ دینا پڑتا''

ماں: ''مجھے جائیداد نہ ملنے کی ایک طرح سے خوشی ہے کہ وہ بھی تمہارا باپ اللے تللوں میں اُڑا دیتا یا اپنی بہنوں اور بھانجوں بھانجیوں کو دان کر دیتا، کوئی نہیں میں نے فیصلہ کیا، اسکی سزا بھگتی اور

اب تک بھگت رہی ہوں، اب صرف چاہتی یہ ہوں کہ دیکھوں کہ کس طرح وہ سزا بھگتتا ہے، جو دنیا کے سامنے بگلا بھگت بنا پھرتا ہے''

روبی: ''امی، آپ زمان سے ایک مرتبہ مل تو لیں''

ماں: ''میں نے کہا نا کہ وہ شخص اور اسکا گھر تمہارے لئے مناسب نہیں''

روبی: ''آپ اُن سے ملے بغیر اُن کا گھر دیکھے بغیر یہ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ یہ تجویز نامناسب ہے''

ماں: ''میں اُن کے بارے میں معلومات حاصل کر چکی ہوں تمہارے باپ کو تو میری وجہ سے جرات نہیں ہوئی دوسری شادی کی مگر زمان کے باپ نے تین شادیاں کی ہیں پھر اُس شخص نے جس طرح دولت جمع کی ہے ہر ایک زبان پر کہانیاں ہیں اُس گھر میں تمہاری زندگی عذاب سے کم نہیں ہوگی اور جو دولت اس راستے سے آتی ہے وہ بڑی تیزی سے جاتی ہے اور جاتے ہوئے بہت کچھ اپنے ساتھ لے جاتی ہے''

روبی: ''امی زمان کا کہنا ہے کہ ہم دونوں الگ گھر میں رہیں گے''

ماں: ''ہونہہ، یہ سب ایک جیسی باتیں کرتے ہیں ابھی اُس کے پاس ہے کیا کہ تم اس طرح کی باتوں پر بھروسہ کیے بیٹھی ہو''

روبی: ''دیکھیں ہر زمانہ اور ہر آدمی اور ہر گھر ایک جیسا نہیں ہوتا، میں بھی آپ جیسی نہیں ہوں، ابو جیسی بھی نہیں ہوں ہم سب کی تعلیم اور تربیت کا بہت فرق ہے اب عورت کو کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس گھر سے ڈولی جا رہی ہے اب اس گھر میں جنازہ آنا چاہیے، ان سب تبدیلیوں کا ہمیں پورا شعور ہے، میں بھی آپ کی اگر خود اپنی پسند کی شادی کا فیصلہ کر لوں تو مجھے یقین ہے کہ آپ اور ابو میرے ساتھ وہ کچھ نہیں کریں گے جو نانا ابو اور نانی اماں نے آپ کے ساتھ کیا، آپ بیشک ہمیں کچھ نہ دیں تین کپڑوں میں اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیں''

ماں: ''یہ سب کھوکھلی باتیں ہیں ڈائیلاگ ہیں کسی تھیٹر کے کوئی پڑھی لکھی لڑکی تین کپڑوں میں خوش نہیں رہ سکتی، کوئی لڑکی اپنی پسند کی شادی اس لئے نہیں کرتی کہ شادی کے بعد کے دن رات وہ محنت مزدوری میں گذار دے یا ڈبل شفٹوں میں کام کرنے والے شوہر کا انتظار کرتی رہے، زندگی حقیقتوں کا مجموعہ ہے کوئی ان سے کیسے بھاگ سکتا ہے''

روبی: ''امی آپ نے عمر کا زیادہ حصہ اپنے کمرے میں بند رہ کر گزارا ہے اپنے آپ سے باتیں کی ہیں، میں ثابت کروں گی کہ میں زندگی اور لوگوں کو آپ سے بہتر جانتی اور پہچانتی ہوں''

(۶)

(پروفیسر کا گھر، شام کا وقت)

مس سوال نامہ: ''سر یہ سارے اخبار آپ روزانہ پڑھتے ہیں اور یہ جو کتابیں ہیں یہ ساری آپ نے

پڑھی ہوئی ہیں؟''

پروفیسر: ''دیکھو یہ جو ہماری دُنیا ہے اس کے بارے میں جاننے کا حق ہم سب کو ہے اور ضروری نہیں کہ جو کچھ اس کے بارے میں لکھا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہو۔ کیونکہ اخبارات میں معلومات ہوتی ہیں، علم نہیں، علم کے لیے اور زیادہ ریاضت کرنی پڑتی ہے۔''

مس سوال نامہ: ''سر کیا کرنا پڑتا ہے؟''

پروفیسر: (ہنستے ہوئے) ''میں نے کہا ریاضت، مجھے یقین ہے تم اس کو جتنی مرتبہ بھی لکھو گی غلط املا کے ساتھ لکھو گی مگر ہم ٹیچر غلطیاں بتانے سے تھکتے نہیں ہیں اور نہ اپنے شاگردوں سے اُمیدیں باندھنے سے اُکتاتے ہیں۔''

مس سوال نامہ: ''آپ بہت اچھے ہیں سر، میں آپ کی مسز سے ملنا چاہتی تھی وہ اپنے کمرے میں ہیں جی؟''

پروفیسر: ''نہیں وہ کہیں گئی ہوئی ہیں۔''

مس سوال نامہ: ''ابھی آجائیں گی؟''

پروفیسر: ''وہ کافی دن کے لیے گئی ہیں۔''

مس سوال نامہ: ''آپ کبھی فنکشنز میں بھی اُن کو نہیں لائے؟''

پروفیسر: ''ہاں وہ زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتی۔''

مس سوال نامہ: ''اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ جیسی طبیعت نہیں رکھتیں؟''

پروفیسر: ''دیکھو بھئی یہ وہ موضوع ہے جس پر بات کرنے سے میں گھبراتا ہوں۔ آپ بہتر ہے اپنی اسٹڈیز کے حوالے سے کوئی بات کریں۔''

مس سوال نامہ: ''سر اسٹڈیز کے لیے تو کلاس روم ہی کافی ہے مجھے بہت شوق تھا یہ دیکھنے کا کہ آپ کی مسز کیسی ہیں؟''

پروفیسر: ''اگر تو آپ کو اُن کی کوئی تصویر درکار ہے تو وہ میں جناب کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں چاہتا ہوں اس موضوع پر آپ کی مزید توجہ حاصل نہ کروں۔ ہر شخص کی زندگی میں ایک آدھ گوشہ ایسا ہونا چاہیے، جس میں کوئی نہ جھانکے۔''

مس سوال نامہ: ''سر آپ خوابوں پر یقین رکھتے ہیں؟''

پروفیسر: ''یقین رکھنے کا کیا مطلب؟ خواب تو سبھی دیکھتے ہیں اور ہم ٹیچر تو زیادہ ہی دیکھتے ہیں۔''

مس سوال نامہ: ''نہیں میرا مطلب تھا آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ خوابوں میں سچائی ہوتی ہے؟''

پروفیسر: ''دیکھو اگر تمہیں شوق ہے تو میں تمہیں بہت سی کتابیں دے سکتا ہوں۔ اب فال نامے اتنے اہم نہیں رہے جتنی نفسیات کی کتابیں ہر خواب کے رمز کو کھول کے رکھ دیتی ہیں۔''

مس سوال نامہ: ''سر میں نے تین چار مرتبہ خواب میں آپ کو دیکھا ہے۔''

پروفیسر: ''اس کے بعد آپ ڈر گئیں؟''

مس سوال نامہ: ''نہیں سر یہ بات نہیں میں نے ہر مرتبہ محسوس کیا کہ خواب میں آپ میرے پاس آتے ہیں اور کچھ کہنے کی کوشش کرتے ہیں مگر یا کہتے نہیں ہیں یا پھر مجھے سنائی نہیں دیتا۔''

پروفیسر: ''اصل میں بہت زیادہ بولنے والے کرداروں کو ہماری خواہشیں خوابوں میں گونگا کر دیتی ہیں۔ ممکن ہے آپ نے بھی میرے لمبے لیکچروں سے تنگ آ کر میرے ووکل کارڈز نکلوا دیئے ہوں، کم از کم اپنے خوابوں میں۔''

مس سوال نامہ: ''میں تو سر اس لیے آئی تھی کہ آپ سے پوچھوں کہ جو کچھ آپ کہنے سے خوابوں میں جھجک رہے ہیں وہ دراصل ہے کیا؟''

پروفیسر: ''جو بات کہتے میں خوابوں میں جھجکتا ہوں وہ بھلا تعبیروں میں کس طرح ادا کر دوں؟ تم اپنے ننھے سے ذہن پہ زیادہ بوجھ نہ ڈالا کرو۔ ٹھہرو تمہارے لیے کوئی چائے کا بندوبست کرتے ہیں۔''

(زمان کمرے میں داخل ہوتا ہے)

زمان: ''سر میں بغیر اجازت ہی اندر آ گیا ہوں، آپ کی بیل شاید کام نہیں کر رہی، مگر مجھے پتا تھا کہ آپ اکیلے ہی ہوں گے گھر میں۔''

پروفیسر: ''آ جاؤ بھئی زمان اتنا بھی اکیلا نہیں ہوں، یہ آپ کی ایک کلاس فیلو بیٹھی ہیں۔''

زمان: ''سر مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ مجھے یا تو دوسرے کمرے میں لے جایئے یا پھر میں مس سوال نامہ کے جانے کا انتظار کر لیتا ہوں۔''

مس سوال نامہ: ''میں سنے بغیر بتا سکتی ہوں کہ تمہیں سر سے کیا بات کرنی ہے؟''

زمان: ''آپ تو سمجھے بغیر بھی بتا سکتی ہیں کہ اس سلسلے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔''

پروفیسر: ''زمان اگر ایمرجنسی نہیں تو پلیز کچن میں جاؤ، تین کپ اچھی والی چائے بناؤ پھر اپنی اس کلاس فیلو کو چائے کا کپ ختم کرنے دو، پھر بیٹھ کر باتیں کرتے جائیں گے۔''

مس سوال نامہ: ''سر میں چائے بناتی ہوں اس عرصے میں زمان آپ سے وہ بات کر لے جو مجھے پتا ہے کہ کیا ہے اور کس کے بارے میں ہے اور یہ بھی پتا ہے کہ وہ کیوں پوری نہیں ہو سکتی۔''

زمان: ''شکر ہے سر، ورنہ یہ خاتون ہر جگہ موجود ہوتی ہے حتیٰ کہ یہ میرے ابا جی کے پاس بھی پہنچی ہوئی تھی۔ شاید انہیں زیادہ عمر کے لوگوں میں خصوصی دلچسپی ہے۔ سوری سر۔''

پروفیسر: ''نیور مائینڈ، مجھے اپنی عمر چھپانے کا شوق نہیں اور نہ میں اپنی بڑھتی عمر سے خوف زدہ ہوں۔ تم بتاؤ کیا بات ہے؟''

زمان: ''سر روبی کی امی نہیں مان رہیں، کوئی راستہ نکالیں سر، ورنہ میں مر جاؤں گا۔''

پروفیسر: ''مر تو رہے ہو تم، فی الحال روبی پر مگر ویسے جب تک ہم زندہ ہیں تمہیں سچ مچ مرنے نہیں

دیں گے۔''

زمان: ''سر اصل میں روبی کی امی پتا نہیں کیوں اس بات سے چڑی ہوئی ہیں کہ میرے والد نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں۔ اب بتایئے کسی والد کے کسی عمل کی سزا اولاد کو کیوں ملے؟''

پروفیسر: ''مگر میری جان یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ روبی کی امی سے بات کرنے کے لیے تم نے میرا انتخاب کیوں کیا؟''

زمان: ''نہیں سر میں آپ سے مشورہ چاہتا تھا کہ کیا میں براہِ راست اُن سے ملوں؟''

پروفیسر: ''دیکھو کھیل بگاڑ نہ بیٹھنا۔ جو کچھ مجھے روبی نے بتا رکھا ہے اُس کی بنیاد پر میں سمجھتا ہوں کہ وہ خاتون کافی مضبوط ارادے بلکہ ضد کی مالک ہیں اور اُن سے ڈیل کرنے کا طریقہ بالواسطہ ہو سکتا ہے براہِ راست نہیں۔''

زمان: ''سر یہی تو آپ سے پوچھنا ہے کہ آخر بالواسطہ طریقہ کیا ہو؟''

پروفیسر: ''جو کچھ مجھے بتایا گیا ہے اُس کے مطابق روبی کے والد جیسے جیسے تمہاری تعریف کریں گے روبی کی ماں تم سے اور بدگمان ہوتی جائے گی۔ وقت سے زیادہ ثالثی کرنے والا اور کوئی نہیں اس لیے تھوڑا وقت لو اور دو اور ذرا سوچنے بھی دو، یہ لو بھئی واہ بھی واہ۔ چائے آ گئی۔ تھینک یو لیڈی آف دی ایوننگ۔''

(۷)

(روبی اور زمان کی ملاقات، وہی دوسرے منظر والا پارک، وقت اور فضا)

زمان: ''تم بولتی کیوں نہیں ہو روبی؟''

روبی: ''تم جلدی میں کیوں ہو؟''

زمان: ''زندگی حادثوں سے بھری ہوئی ہے اور پھر غیر یقینی حالات اور زیادہ افسردہ کرتے ہیں۔ ایسے میں اگر مجھے اپنے خوابوں کی کہیں تعبیر نظر آئی ہے میں اُس تک پہنچنے کی جلدی کیوں نہ کروں؟''

روبی: ''دیکھو جو جاب تمہیں ملا ہے وہ بالکل عارضی ہے، میں تو ہر حال میں تم پر بھروسہ کرتی ہوں مگر امی سے پہلے یہ ابو کی شرط ہے کہ تمہارا جاب مستقل ہو، اُس کے بعد ہمیں امی کے بارے میں کچھ سوچنا ہوگا ورنہ تم جانتے ہو کہ میں اپنی کمٹ منٹ کو پورا کرنا جانتی ہوں۔''

زمان: ''روبی میں نے ایک مرتبہ تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم بھی مجھے اُتنا چاہتی ہو جتنا میں، تو تم نے کیوں کہا تھا کہ نہیں؟''

روبی: ''تم نے میری پوری بات نہیں سنی تھی، میں نے اونچی آواز میں 'نہیں' کہا تھا مگر تم نے مجھے یہ

کہنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ میں تمہیں اُتنا نہیں چاہتی جتنا تم چاہتے ہو بلکہ اس سے بڑھ کر چاہتی ہوں۔''

زمان: ''تم نے اُس وقت یہ لفظ ادا نہیں کیے تھے مگر پتا نہیں کیسے مجھے یقین تھا کہ تم یہی کہنا چاہتی ہو۔''

روبی: ''جب یقین تھا تو پھر آج تفتیش کیوں کر رہے ہو؟''

زمان: ''یہ تفتیش نہیں تصدیق ہے۔''

روبی: ''چائے کے ساتھ کچھ اور لو گے؟''

زمان: ''صرف اقرار۔''

روبی: ''وہ تو ہو چکا۔''

زمان: ''نہیں ہر حال میں اکٹھے رہنے کا وعدہ۔''

روبی: ''وہ بھی ہو چکا۔''

زمان: ''اب میں کسی رکاوٹ اور مشکل کی پروا نہیں کروں گا اگر تمہیں مجھ پر یقین ہے اور مجھے تم پر تو پھر ہم اپنا گھر ایسا بنائیں گے جو نہ تمہارے امی ابو کو نصیب ہوا اور نہ میرے امی اور ابو کو۔''

روبی: ''یاد ہے سر نے صفروں والے گھر والی کاپی اور بات کیسے پکڑی تھی؟''

زمان: ''سر بڑے پڑھے لکھے ہیں مگر عملی آدمی نہیں ہیں۔ انہوں نے دیکھا نہیں کہ صرف صفروں کے سہارے گھر نہیں بنتے اُن صفروں کو معنی دینے والی سہارا دینے والی لکیریں ہوتی ہیں اُن صفروں سے تھامنے والے کچھ ہاتھ ہوتے ہیں جن کے سہارے گھر بنتے جاتے ہیں۔''

روبی: ''مگر وہ تو کھیل تھا یہ کھیل نہیں اور نہ اس کو کھیل سمجھنا ہے۔''

زمان: ''نہ وہ کھیل تھا، نہ یہ کھیل ہے، ہم اپنے تعلق کو اور خوب صورت بنا سکتے ہیں اور اس خوب صورتی کے سہارے زیادہ دل آویز اور مضبوط گھر بنا سکتے ہیں۔''

روبی: ''آج کی شام ایسی ہے کہ تمہاری کسی بات پر تمہیں چھیڑنے کو جی نہیں چاہتا، یہ پتا نہیں یقین اور اعتماد والی شام ہے یا ہر قسم کے خدشے اور خطرے کو پھلانگنے والی شام۔''

زمان: ''روبی میں اگلے ہفتے تمہارے ابو سے ملوں گا اور کوشش کروں گا کہ اُس کے ایک ہفتے کے اندر تمہاری امی سے بھی فون پر بات کروں اور اگر وہ اجازت دیں تو پھر اُن سے براہِ راست بھی بات کر لوں۔''

روبی: ''وہ اول تو فون اُٹھاتی ہی نہیں اور اگر اُن کی پسند کا مخاطب نہ ہو تو وہ بات سنتی ہی نہیں۔ میں ابو کو بھی منع کروں گی کہ وہ میرے سلسلے میں پُر جوش وکالت نہ کریں کیونکہ اس کا اُن پر الٹا اثر ہوتا ہے۔ انہیں احساس ہوتا ہے کہ ہر کوئی اُنہیں اپنے راستے کی دیوار سمجھتا ہے۔''

(زمان کا موبائل بجتا ہے، دو مرتبہ)

روبی: ''سن لو، آج کسی ویٹنگ لسٹ کی بات نہیں ہوگی۔''

زمان: ''نہیں۔ آج مجھے کسی اور سے کوئی بات نہیں کرنی۔ روبی وہ دیکھو، دائیں طرف، اُدھر، تیسری کرسی پر، یہ مس سوالنامہ کس مشن پر ہے؟''

روبی: ''آج تو اس کے میزبان اسلامیات کے پروفیسر ہیں جن کی دوسری اہلیہ کا انتقال گزشتہ مہینے ہوا ہے۔''

(دونوں ہنستے ہیں)

زمان: ''اس غریب کی زندگی میں بھی اب سوالوں کی قطاریں ختم ہو جانی چاہئیں حالاں کہ اس نے میرے گھر میں ایک عجیب طرح کی ڈس انفارمیشن پھیلانے کی کوشش کی تھی۔''

روبی: ''میرا خیال ہے کہ یہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتی۔ بس کچھ اس کے نفسیاتی مسائل ہیں ورنہ یہ ذہانت میں کسی سے کم نہیں۔''

زمان: ''خوب صورت بھی ہے۔''

روبی: ''خیر خوب صورت تو نہیں۔''

زمان: ''اچھا قبول صورت سہی۔''

روبی: ''کس کو قبول؟ کس کے لیے قبول صورت؟''

زمان: ''اچھا بابا یہ بدصورت خاتون ہے، البتہ ذہانت کا سرٹیفکیٹ تم خود اُس کو دے چکی ہو۔''

(روبی کا موبائل بجتا ہے، اس کی گھنٹی مختلف ہے، دو تین گھنٹیوں کے بعد زمان کہتا ہے)

زمان: ''پلیز سن لو۔''

روبی: (خود کلامی کرتے ہوئے) ''میرے گھر کا نمبر ہے۔ ہیلو، ہاں میں روبی ہوں، کیا؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیسے؟ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں ہو سکتا، وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔'' (روبی ہسٹیریائی انداز میں بولنا اور رونا شروع کرتی ہے)

زمان: ''روبی کیا بات ہے؟ پلیز یہ پانی لو، پلیز بتاؤ، کیا ہوا ہے؟ دیکھو لوگ مڑ مڑ کے ہمیں دیکھ رہے ہیں، پلیز اس طرح آواز کے ساتھ مت روؤ۔ روبی ہوا کیا ہے؟''

روبی: ''مائی مدر از ڈیڈ۔''

زمان: ''اوہ نو، کیسے؟''

روبی: ''میرے فادر بہت نروس ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کیسے؟''

زمان: ''آؤ چلیں روبی، آؤ، آؤ، پلیز حوصلہ رکھو، بی کام، ابھی ہمیں بہت مسافت طے کرنی ہے۔''

سمیع آہوجہ

بائی می پلازہ

شاید وہ لمحہ سونے اور جاگنے کی درمیانی دھدن میں پیوست تھا۔

کچن کے خالی پیٹ اور بیوی کی قہر آنکھوں نے اس کی مہمار موڑی، تو دھڑکتے سانس متوازن رکھنے کی مجبوری نے اُسے اور انگلی دبوچے بچے کو نوٹوں سے بھرے سوٹ کیس سمیت طویل وعریض ملٹی سٹوری شاپنگ سنٹر کے سامنے اُگل دیا۔

ہجوم بے کراں کو کاٹتے دھکیلتے وہ چینی کے ڈپو پر لگی لمبی قطار کی طرف لپکا ہی تھا کہ بچے نے اُس کا دامن پکڑ لیا۔ شدید روہانسی آواز اور ملتجی ٹھنکتی آنکھیں اُسے کھلونوں کی دوکان کی طرف کھینچنے لگیں۔ میں نے بچے کا اضطراب اور گونجتی نین چمک کا ملغوبہ اس کی پیاسی کنواں آنکھوں اندر پھینٹا تو وہ موم ہو کر اس کے ساتھ اژدھام میں پیرتا، شیشے کا دروازہ کھول کی یخبستہ وسیع دوکان میں گھس گیا۔

سامنے اک عظیم جثہ سفید ہاتھی راستہ روکے کھڑا تھا۔ ہراساں باپ نے تیزی سے دہشت زدہ بلبلاتے بچے کو اپنی باہوں میں سمیٹا اور دروازے کو پشت سے دھکیلنے لگا مگر دروازہ سیمنٹ کی دیوار بن چکا تھا۔ ہراساں، بے بس نظروں نے ہاتھی کو سر سے پاؤں تک ٹٹولا۔ اُٹھی ہوئی حملہ آور سونڈ اور اُس سے جڑا ہوا سر، دیو قامت بدن اور ستون نما بھاری بھرکم ٹانگیں، سب کچھ ساکت تھا۔ بالکل بے جان، سنگ سفید کا مجسمہ مگر جاندار بننے میں صرف ایک آنچ کی کسر۔

سونڈ کے نچلے سرے پر بیٹھی چند سیاہ مکھیوں نے آنکھوں پر جال مارا تو بے اختیار قہقہہ مارتے وہ بچے کو چومنے لگا۔

ارے یہ تو کھلونا ہے۔

اتنا بڑا___!

معنی خیزی سے سر ہلاتے، بچے کا سر تھپتھپاتے وہ سونڈ کے قریب پہنچا تو مکھیوں نے لفظوں کا روپ دھار لیا۔

سونڈ میں سکہ ڈالیں تو ہاتھی خود ہی آپ کو دوکان میں پہنچا دے گا۔

سکہ ڈالتے ہی ہاتھی نے زور سے چنگھاڑ ماری اور خوف زدہ، چیختے چلاتے باپ بیٹے کو سونڈ میں لپیٹ کر اپنے پیٹ میں اُتار لیا۔

سامنے سے آوازوں کا ٹھاٹھیں مارتا، غراتا سمندر ان پر آپڑا اور وہ ناقابل فہم شور میں غوطے

کھانے لگے۔ لیکن جیسے ہی تہہ میں پاؤں ٹکے تو گرجتے، دہلاتے تھپیڑے ساکت ہو گئے۔ چند سریلی مدھم آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگیں۔

بڑی واضح اور صاف شرتیاں۔

ئی می، بائی می، بائی می___

آنکھوں کے بل جب وہ سروں کے پیچھے چلا تو بائیں طرف کی دیوار کے ساتھ طویل میزوں اور ان پر رکھے کھلونوں کے بے حرکت لبوں سے پھوٹتی آواز، پر ہیجان اعصاب کو تھپکنے لگی۔

بائی می، بائی می___

سامنے گہری نیلگوں دھند کے مرغولوں کے عین اوپر، ٹیلی ویژن کی سفید سکرین___

اور داہنی دیوار پر لکھے موٹے موٹے حروف۔

آنکھ چیونٹیاں لفظوں کے ریزوں سے چمٹ گئیں۔

یہاں تمام کھلونے کمپیوٹرائزڈ ہیں۔ اگر آپ ان میں سکہ ڈالیں گے تو یہ وہی کریں گے جو آپ کی سوچ ہوگی۔

اُس نے بچے کو گود میں بھر لیا۔

بیٹے، دیوار پر لکھا ہے کہ___

مجھے پتہ ہے، میں نے پڑھ لیا ہے۔

تم نے___؟

تم نے پڑھ لیا ہے؟؟

کیسے___؟؟؟

شدید حیرت میں غرق، بت کی گود سے میں نے بچے کو اُتارا۔

جیسے تم نے پڑھا ہے۔

لیکن، لیکن اس نے تو ابھی سکول کا منہ بھی نہیں دیکھا۔

تو کیا صرف تمہیں ہی لفظوں کا ذائقہ چکھنے کا لائسنس ملا ہے۔ تمہاری ساری عمر کے آگے اس کے چار سال شامل ہوئے ہیں۔ میں ان دونوں کی انگلی پکڑے پہلے کاؤنٹر پر آیا۔

دلربا سرخ وسپید مورت کی بے چھپک جاگتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اُتر آئیں۔ نم آلود نازک تراش کے کتھی ہونٹوں کی جنبش سے بے قابو الفاظ اُبل رہے تھے۔

بائی می، بائی می___

بے اختیار میرا ہاتھ جیب میں اُتر گیا۔

سکہ ڈالنے کی دیر تھی کہ مورت تھرکتی لڑکی میں ڈھل گئی۔ بال لہراتے، گنگناتے، سبزہ زاروں

اور پھول پھلواریوں کا عکس سمیٹے وہ قالین پر ہمارے سامنے بچھ گئی۔ خوبصورت گاؤدمی کلائی لہرائی اور نرم و نازک ہاتھ کی پوروں میں دبی کون آئس کریم بچے کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔ دلنشین سروں میں جلترنگ بجنے لگا۔

اٹ لوز بو، یولواٹ۔

بچے نے آئس کریم کے دام دیے اور لمبی زبان نکال کر چاٹنے لگا۔

وہ حیرت زدہ، فکروں میں چور چور، مجھے جھنجھوڑنے لگا۔

بتاؤ، کیا چیزیں بھی اب، انسانوں سے پیار کرنے لگی ہیں۔

میں مسکراتا اس کا بازو تھامے، اُسے دوسرے کاؤنٹر پر لے آیا۔

اس دوکان کی بلند دیواریں، رنگ وروغن اور مدہوش ہوا تمہارا یہ تجسس جلد ہی چھین لے گی۔

ابھی صبر سے اسے بچا رکھو۔

نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔

ہو کیوں نہیں سکتا، کیا تمہیں اب شور سنائی دیتا ہے؟

شور___؟

اور اس کا تمام بدن سوال کے پہیے پر سوار، چاروں اور گھوم گیا۔

یہاں تو شور تھا ہی نہیں۔

کبھی بھی نہیں۔

مسکراہٹوں کی کھلتی کلیوں نے بچے کو ٹھکورتے، کھلونے کی طرف متوجہ کیا۔

اک آویزاں برف قاشیں اور ہر قاش کے عکس میں منجمد نظریں اور پھر اس کے آگے پیچھے ایک دوسرے میں چپکی لمبی قطاروں میں ایک دوسرے کے عکس عدسوں میں لشکارے مارتے ساکت پلڑے تمام خشکیوں پر آویزاں۔ اس انجماد کی پشت پر پنچایت جمی تھی۔

ان کے پیچھے وسیع صحن میں لاتعداد سور قانون کی لکھی تختیوں میں ملبوس، صحن کی دیواروں سے ملے ایک دوسرے سے پیوست چھوٹے چھوٹے، بوا بلتے، ہیبت ناک تاریک مجرموں سے بھرے کابک۔

سب کے پٹ بٹنوں کی طرح بند ہوتے، کھلتے ہونٹوں سے ایک ہی مدھم آواز یکساں اُتار چڑھاؤ کے ساتھ پھوٹ رہی تھی۔

بائی می، بائی می___

دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ کے کبوتر اُترنے لگے۔

ابو ڈالو بھی سکہ___

ہاتھ کا چوہا جیب بل میں گھس گیا۔

سکہ پڑتے ہی بندر نے بلیوں کو گردنوں سے پکڑ کر ان کے سر زور سے آپس میں ٹکرا دیے۔

بھیجوں کے چھینٹے اُڑتے ہی دونوں پلڑوں میں تلتی کچی روٹیوں کو گھورا اور خوخیاتے جھپٹتے میری گردن اپنے آہنی پنجے میں دبوچ لی اور اس کے دوسرے پنجے میں چشم زدن میں میری جیب سے سکہ نکال کر ترازو میں ڈال دیا۔ کھنکتی آواز سے روٹیاں پک کر پھول گئیں۔ بندر نے ترازو کے مساوی کانٹے سے آنکھیں اُٹھائیں اور مساوی تلتی روٹیاں منہ میں بھرتے ہوئے دونوں بلیوں کی کھال کھینچی اور پلڑوں میں علیحدہ علیحدہ راسیں ڈال کر آوازیں لگانے لگا۔

تازہ گوشت، اعلیٰ گوشت، بے نظیر فر۔

آوازوں کے گولے پھٹتے ہی پنچایت میں ہنگامہ اُتر آیا۔

پنچوں کے پشت دروازے پر حاجب نے پوری قوت سے اپنی گوپھے دار لاٹھی برسائی۔

گھنٹوں کی طرح بجتے دروازے کھلے اور حاضرین، پنچوں کی نمودار ہوتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

سر پنچ گدھے کے دونوں طرف تین تین لومڑ، بلیوں کی کھال کی ٹوپیاں مڑھ کر بیٹھ گئے۔

گدھے نے پہلے دولتی چلائی اور ہتھوڑے سے ڈسک کو زور زور سے کوٹتے چیخا۔

ڈھیچوں، ڈھیچوں، ڈھیچوں۔

ٹان، ٹان، ٹان۔

لومڑوں کے بجتے ہتھوڑوں کے ہمرکاب غراہٹیں ٹوٹ پڑیں۔

غرغر۔

آڈر، آڈر، آڈر۔

اور قانونی تختیوں میں ملبوس سوروں کی طرف تھوتھنیاں گھومیں۔

نمائندہ انصاف مجرم کو حاضر کرے۔

زنجیروں میں جکڑے لاغر جسم کو کھینچتے، چیرتے سور دانتوں نے اُسے پنچوں کے سامنے کھڑا کر کے سر ڈسک پر ٹکا دیا۔

ساتوں پنچ اپنے گلوں کی انتہا پر چیخے۔

نمائندہ تسلطِ اخلاق جرم بیان کرے۔

جرم؟

اس کے بدن پر اُگا بال بال جرائم کی بند پوٹ ہے۔ تفصیلات میں جانا پنچایت کو انصاف سے ہٹانے کے مترادف ہے۔

اس نے کھلی آنکھوں کانوں اور ناک سے سرکاری خزانے میں بند روشنیاں، آہنگ اور خوشبوئیں لوٹنے اور لٹانے کی کوشش کی۔

بیتاب ہراساں سرپنچ چیخا____

تو کیا سب کچھ لٹ گیا۔

نہیں، ہم نے اس واضح واردات قتل کو موقع پر ہی پکڑ لیا۔

ایسا سنگین جرم____؟

اس کی سزا۔

سرپنچ سمیت تمام پنچوں کے پے در پے برستے ہتھوڑوں نے سر کچل ڈالا اور اس کا مغز، آنکھوں کانوں اور ناک سے بہ نکلا۔

نمائندہ تسلط اخلاق، اُمید ہے کہ تم انصاف سے مطمئن ہو گے۔ اس لاش کو چوراہے پر لٹکا کر اس کے سر کے نیچے بلب روشن کر دو تا کہ یہاں کے باسی اپنی نگاہیں پاک وصاف کر لیں اور ساتھ ہی سب پنچوں کے چہرے دوسرے طرف گھوم گئے۔

نمائندہ صفائی، اُمید ہے کہ تمہاری بھی انصاف سے تسلی ہو گئی ہو گی۔ یا پھر____؟

اس کے سارے جسم میں لرزش چھوٹ گئی۔

نہیں نہیں آپ کا انصاف بالکل بجا ہے۔

سرپنچ نے یکدم چیختے ہوئے ہتھوڑے سے ڈسک پیٹ ڈالا۔

آڈر، آڈر، آڈر۔

ڈھچوں، ڈھچوں، ڈھچوں۔

انصاف کے تقاضوں پر تمہاری تائید بھی توہین پنچایت ہے۔ بس ایک چپ۔

ہاں بھئی ہو جائے۔

طبلے سارنگیوں کی آواز جاگتے ہی سرپنچ ڈسک پر چڑھ کر ناچنے لگا۔ دروٹ زمانہ کٹ، بھلے دن آ گئے نیں۔

اور جب طبلے سارنگیاں تھک کر ہانپنے لگیں تو وہ اپنی نشست پر کود گیا۔

دوسرا ملزم حاضر کیا جائے۔

سکیاں لیتے ملزم کو سر ڈسک پر دباتے ہی فرد جرم بھی عائد ہو گئی۔ ملزم پچھلے مجرم کی سزا دیکھ کر رو دیا تھا اور اب تک روئے چلا جاتا ہے۔

ہائیں، یعنی خلق خدا کو ہم سے متنفر کرنے کا حربہ؟

اس کی سزا تو پچھلے جرم سے بھی دوگنی ہے۔

اور ساتوں ہتھوڑوں کی ضربوں نے اس کا اخروٹ توڑ دیا۔

اس لاش کو، آدمیوں کے ساتھ باندھ کر سرکوں کے عین درمیان چلایا جائے، تا کہ ٹریفک کی دو

رویہ لائنیں لگ جائیں اور رنگ کے اخراجات کٹ ڈاؤن کیے جا سکیں۔

شہر کی سڑکوں پر کھنچتی لاش کے لہو سے بنتی لکیروں کو تکتے بچے کی چیخیں کل گئیں۔

ابا، میں یہ کھلونا نہیں دیکھتا، مجھے ڈر لگتا ہے۔

تو تم نے ایسی سوچوں کے ساتھ سکہ ہی کیوں ڈالا تھا۔

میں نے____؟

نہیں تو، سکہ تو____

اور میں نے اُسے اپنی آنکھوں میں جکڑتے یاد دلایا کہ سکہ تو اُس نے ڈالا تھا۔

میں نے____؟

مگر، مگر میں نے تو یہ نہیں سوچا تھا۔

اور بچہ اُسے کھینچ کر دوسرے کاؤنٹر پر لے آیا____

تا حد نظر بے برگ وثمر ٹنڈ منڈ درختوں کا قبرستان، ویرانی کے پر ہول سناٹے مین تنوں کی زبانیں گاڑے، شاخوں کی اُجاڑ بانہیں پھیلائے گریہ کناں تھا۔

بائی می، بائی می، بائی می____

بچے کی بھیگی آنکھیں باپ سے لپٹ گئیں۔ وہ تیزی سے سکہ ڈالتے بولا____

شاید بہار آ جائے____

گلے میں سکے کی کھنک گونجتے ہی موسم بدل گیا۔

سیاہ ڈراونی رات نے بنجر منظر کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا۔ کڑکتی بجلی اور گھن گرج کے ساتھ تیز وتند بارش برس رہی تھی۔ قد آور، بے برگ درخت پر بیٹھے دونوں پرندے پروں میں سر دیے کانپ رہے تھے۔

کپکپاتے نچلے سر لہرائے اور یخ بستہ سردی میں وہیں جم گئے۔

گھگیا گھر کت۔

دوسرے نے اپنا ایک پر حیرت سے آنکھ سے نیچے اُتارا اور پھر فوراً منہ سر ڈھانپ لیا۔ مگر سر دلہر پروں سے پھسلی اور آنکھ کے راستے اس کی ہڈیوں میں اُتر گئی۔ ٹھٹھرتی آواز وہیں جم گئی۔

ہائے بڑی سردی اے____

گھگیا گھر کت۔

ہائے بھلیئے لوکے، اج تاں بڑی ٹھنڈاے۔

گھگیا گھر کت۔

ہائے سردی۔

گھگیا گھر کت۔

اونچے سروں میں یکدم چڑ چڑاہٹ بھر گئی۔

دن چڑھے گا تے کجھ کراں گا۔

اسی تکرار کی چند گھڑیوں میں سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور سارے اندھیرے اور باراں کو چاٹ گئی۔ بھیگے پروں کو گھگے نے پہلے پھیلایا اور زور زور سے پھڑ پھڑاتے پانی جھٹکا اور پوری قوت سے ایک زفند بھر کر فضا میں بلند ہو گیا۔ ایک طویل چکر لے کر جب وہ نئی کونپلوں میں ملبوس قد آور درخت پر منڈلایا تو گھگی نے پروں سے سر نکالا۔ پھیلے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں مہکتی چہکار سوال بن کر گھگے کے ساتھ پرواز کرنے لگی۔

گھگیا گھر کت۔

گھگے نے ہوا کے سمندر میں پروں کے پتوار چلاتے، اونچے سروں میں چہکار چھوڑی۔

نی ___

گھگے نوں کی لگے گھراں نال ___

ڈوبتی چہکار کے ساتھ ہی گھگا بھی آسمان مین ننھا سا سیاہ دھبہ بن گیا۔ گھگی کی مایوس، ہراساں نظروں سے ٹپکے دو آنسو اُس سیاہ نقطے پر ہی منجمند ہو گئے۔

بچے نے فوراً باپ کا کرتا کھینچا۔

یہ گھگا گھر کیوں نہیں بناتا؟

کیا پتہ ___

تو، تو یہ دونوں مل کر کیوں نہیں بنا لیتے؟؟

پتہ نہیں ___

پر، یہ گھگی اس سے کیوں کہتی ہے۔ خود کیوں نہیں بنا لیتی ___؟؟؟

غصیلی جھنجھلاہٹ نے یکدم بچے کو گھیر لیا اور لفظوں کے پے در پے تھپڑ اُس پر برس گئے ___

تم اتنے سارے فضول سے سوال کیوں کرتے رہتے ہو۔ مجھے کیا پتہ کہ کیوں نہیں بناتی۔ نہ بنائے جائے جہنم میں۔ مجھے ___

ڈبڈبائی زخم خوردہ آنکھوں میں ڈوبتی چمک کی آواز سے میں لرز گیا۔

میں نے ___

میں نے تو یوں نہیں سوچا تھا، تو پھر یہ سب ___؟

میں نے یکدم اس کی قہر برساتی آنکھوں پر ہاتھ دھرا اور اُسے اگلے کاؤنٹر پر لے گیا۔ آنکھوں سے انگلیوں کی پٹی اُترتے ہی سارے روشن منظر پر ایک دیو قامت بھاری بھرکم فل بوٹ چھا گیا۔

مرجھائے پھول چہرے اور ڈھلتی عمر کو تھپکی دیتے میں نے منتشر اور لاچار آنکھوں میں سدھائی ہوئی سہمی ہوا کے کڑوے کسیلے ہونٹوں میں سکہ ڈال دیا۔

بوٹ کی قومی ہیکل پیشانی کے ٹانکے ٹوٹ گئے اور مگر مچھ کے چرے ہوئے جبڑوں میں شہر نمودار ہو گیا۔

ہر طرف اک ہوکا عالم تھا۔

لمبی طویل ایک دوسرے کو کاٹتی، بھنبھوڑتی سڑکیں چپ چاپ لڑتی جا رہی تھیں۔ اونچی نیچی عمارتوں کی دیواریں ایک دوسرے کے سہارے کھڑی، خوف و ہراس سے لرز رہی تھیں۔ گھروں، محلوں، بازاروں کی آنکھیں مچی ہوئی اور دروازے آنسو بہاتے، اپنے نہ آنے والے بچوں کے انتظار میں کھلے ہوئے مگر آوازیں ناپید، گمشدہ۔

مختلف سڑکوں پر بھاری بھرکم بڑی بڑی چٹان نما توپیں، ہیوی آرمڈ کاریں، ٹرک اور ٹینکوں کو طویل آفتوں سے باندھ کر، کھینچتے، گرتے، لڑھکڑاتے بندروں کی لمبی دورویہ قطاریں۔

مگر چیختے چلاتے گالیاں دیتے اختیار نامے سروں پر مسلط۔

شاباش ___

کھوبے دے چونیو، ہل کر زور لگاؤ، شاباش ___

حکم ناموں کی نازگشتیں ___

ہے شاباش، ہل کر نعرہ مارو، شاباش ___

پنج نعرے پنج تنی تے اک نعرہ ___

مارو ___

شڑاک، شڑاک ___

مگر ساری آوازیں حلقوم میں بند اور سارے پژمردہ ہونٹ قبرستان، کوڑوں کی ضربوں سے نہ سنائی دینے والی آہ و بکا آنکھوں میں قید ___

ہر چوک میں الاؤ دہک رہے تھے۔ تپش سے گرد و نواح کی تمام عمارتیں پگھل کر لاوا بن چکی تھیں۔ بس ابھی بہنے کے لمحے کا انتظار ہو رہا تھا اور اُلٹے لٹکے بندروں کے جسموں، کھوپڑیوں سے نکلتے بوند بوند تیل کی ایک لمبی قطار آگ پر پڑے برتنوں میں ٹپک رہی تھی اور جس سے اُڑتی، آگ پر گرتی چھینٹوں سے الاؤ کی غراہت اور بھی تند ہو رہی تھی۔

مگر آواز ___

سب طرف گھپ سناٹا تھا ___

سڑکوں کی دورویہ کھلی دوکانوں پر بندروں کے قطار اندر قطار ہجوم ___

اور کھیلی دوکانوں کے کھلے جبڑوں میں کولہو چل رہے تھے۔ جن میں باری باری ہر ایک کو پیل کر تیل نکالا جاتا اور پھر کھال کے نچڑے مرگ چھالے کو استری خانے میں دھکیل کر دو اُلٹے سیدھے ہاتھ مارے جاتے اور بندر کو دھکیل کر پھر سے قطار میں کھڑا کر دیا جاتا۔

میں نے، میں نے یہ تو نہیں سوچا تھا۔

میری خوف زدہ لرزتی آواز ساری دوکان میں گونج گئی ___

باپ بیٹا دونوں ہی ایک دوسرے کی دہشتناک آنکھوں میں سوال بن گئے ___

میں نے، میں نے تو یہ نہیں سوچا تھا۔ کہیں تم تو ایسی باتیں ___ ؟

اور بچے کی آواز ذبح ہوتے جانور کی طرح پھڑکنے لگی ___

ابا ___

میں نے نہ تو سکہ ڈالا اور نہ ہی میری سوچ ایسی ___

ابا ___ سکہ تو تم نے ڈالا تھا ___

چلو جلدی یہاں سے ___

مجھے ڈر لگ رہا ہے ___

میں نے سکہ ___ ؟

اور میں خوف کی تند بارش میں یگ وتنہا بھیگنے لگا۔

تو کہیں ___ ؟

مجھ میں یا میرے بچے میں تو سکہ نہیں ڈالا گیا ___ ؟؟

اور ڈالنے والے کی سوچ ہم میں ___ ؟؟؟

نہیں ___

اک چیخ کے ساتھ ہی اس نے یکدم پہلے بچے کے ایک ایک عضو کو ٹٹولا اور پھر اپنے جسم کے ایک ایک ملی میٹر کی تلاشی لے ڈالی۔ مگر کسی بھی نئے سوراخ کا کوئی نشان نہیں تھا۔

کہیں، کہیں، یہ سکے ہمارے چہکنے، گنگناتے، غذا نگلتے دھانوں سے تو نہیں اُتر رہے ___ ؟

نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

کہ دفعتاً ٹیلی ویژن کی سکرین روشن ہو گئی اور ظاہر ہوتے لفظوں کے بچھو دماغ میں ڈنگ مارنے لگے۔

یہاں سے آگے ٹرانس فارمیشن کا دور شروع ہو گیا۔ آپ ہر کھلونے کو دیکھتے ہی اس کی شکل اختیار کر سکیں گے۔

بچے کے تن بدن سے سارا خوف بھاپ بن کر اُڑ گیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

آؤ ابا ___ آگے چلیں دیکھیں تو کتنی عجوبہ بات ہو گی وہاں ___

ایک کھلونے کا روپ دھارنا ___ ؟

آؤ نا ___

اور بچے کے چہرے پر یکدم ہی نیلگوں دھند کا تجسس چمکنے لگا اور اس کے قدم لہراتی دھند کی طرف بڑھنے لگے۔

یخ بستگی کے عالم میں بچے کے منہ سے پھوٹتی آواز کو وہ اجنبیت کے چھاج میں پھٹک رہا تھا۔

کیا وہ میرا بچہ ہے ___ ؟

کہیں اس کی ساری محبت، سوراخ میں کھنکنے سکے سے تو نہیں نکل رہی ___ ؟؟

کیا میں ہی اس کا باپ ہوں ___ ؟

کہیں مجھ میں ہی تو سکہ نہیں ___

جو، جو مجھ سے اس کی محبت کے بدلے، کچھ اور نہ چاہتا ہو ___

کیا ___ ؟

کیا ___ ؟؟

کیا ___ ؟؟؟

اور وہ ساکت دھند کی نیلگوں لہروں میں بچے کو گم ہوتے، تکتے بڑبڑاتا رہا۔

لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کھلونوں کی بھری دوکان کے شور میں، نوٹوں سے بھرا سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکائے، اک نئے کھلونے کی بھاری بھرکم آواز مجسم ہو رہی ہے ___

بائی می، بائی می، بائی می۔

احمد صغیر صدیقی

توازن

مشکل سے آدھے گھنٹے کا کام تھا۔ ایک چھپے فارم پر تین چار نام اور ایک دو تاریخیں ٹائپ کرنی تھیں۔ اسی طرح ایک اور چھپے ہوئے فارم پر کچھ نام اور کچھ کوائف ٹائپ کرنے تھے اور بس۔ یہ چھپے ہوئے خالی فارم بازار میں دستیاب تھے اور میں نے پہلے ہی سے خرید رکھے تھے۔ ان کے لیے مجھے چھ روپے ادا کرنے پڑتے تھے۔ ٹائپ ہوجانے کے بعد دونوں فارموں کو نوٹیری پبلک سے اٹسٹ (Attest) کرنا تھا۔ میں نے معلم کر رکھا تھا یہ کام بیس روپے میں ہو رہا تھا۔ البتہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ٹائپ کرائی کیا لی جارہی ہے۔

سٹی کورٹ کے احاطے میں درجنوں کے حساب سے ٹائپ کرنے والے، تصدیق کرنے والے اور فارم فروخت کرنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں بعض دکانیں بھی تھیں جن کے اندر یہ تینوں کام اکٹھے ہو رہے تھے۔ طوالت سے بچنے کے لیے میں ایک ایسی ہی دکان میں چلا گیا۔ یہاں لائن سے کئی لوگ میزوں پر ٹائپ رائٹر رکھے بیٹھے تھے۔ ایک طرف ایک صاحب میز پر چند مہریں اور اسٹیمپ پیڈ وغیرہ رکھے بیٹھے تھے۔ اسی طرح دکان کے منہ پر ایک جانب ایک شخص ایک میز پر ایک صندوق رکھے بیٹھا تھا جس میں فارم وغیرہ تھے جبکہ دوسرے بازو پر ایک فوٹو اسٹیٹ مشین رکھی تھی اور اُس کے سامنے ایک آدمی اسٹول پر بیٹھا یہ کام نمٹا رہا تھا۔

میں اندر گھسا تو میں نے دیکھا کہ ٹائپسٹوں میں سب کے سب مصروف ہیں۔ ان کے نزدیک رکھے اسٹولوں پر میری ہی طرح کے لوگ بیٹھے اپنے اپنے کام کرا رہے تھے۔ البتہ قطار کے سب سے آخری سرے پر اندر کی جانب ایک میز خالی تھی۔ میز پر ٹائپسٹ بیٹھا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ میں نے آگے جا کر اُس سے علیک سلیک کی۔ یہ شخص پختہ عمر کا تھا۔ اس کے چہرے پر داڑھی تھی۔ آنکھوں ہر عینک اپنے لباس سے یہ کوئی مذہبی آدمی نظر آتا تھا۔ ہاتھ میں اس کے جو کتاب تھی وہ وظائف کی تھی۔ اُس نے اپنی کتاب ٹائپ رائٹر کی دائیں جانب خالی جگہ پر رکھ دی اور میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اُس کے ہونٹوں کا ایک گوشہ وقفے وقفے سے سکڑ رہا ہے۔ یہ غالباً کسی Inner Tension کی علامت تھی۔

میں نے اُس سے اپنے کام کی نوعیت بیان کی۔ اس نے کہا ہو جائے گا۔ میں نے اس سے معاوضہ دریافت کیا۔ اس نے کہا چھوٹے فارم کی ٹائپ کرائی پچاس روپے اور دوسرے کی ساٹھ روپے ہو گی۔ میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ پہلے فارم میں صرف دو یا تین سطور ٹائپ کرنی تھیں اس کے لیے وہ

پچاس روپے مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا ''بھائی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک فرام کے دس پندرہ روپے بھی کم نہیں۔ کام ہی کتنا ہے؟'' اُس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔ ''اس رقم میں ہم تصدیق بھی کرا دیں گے'' اس نے کہا ''دونوں فارم پچیس روپے میں Attest ہو رہے ہیں'' میں نے اُسے بتایا ''بس زیادہ سے زیادہ پچاس روپے بنتے ہیں۔''

''جی نہیں'' آپ کسی اور سے کرالیں'' اس نے رکھائی سے کہا اور اپنی کتاب کو میز پر ٹھیک کہا: میں نے بالکل ٹھیک رقم بتائی ہے۔ ''آپ دیکھیں اس میں کام ہی کتنا ہے۔ پھر فارم بھی میں لے آیا ہوں۔ آپ پیسے کم کریں۔'' ''بس یہی معاوضہ ہوگا'' اُس نے کتاب اُٹھا کر گود میں رکھ لی، آپ پیسے کم کریں کچھ'' میں نے اصرار کیا۔ اس نے کہا ''اچھا سو روپے دے دیجیے گا۔'' میں نے اِرد گرد نظر ڈالی۔ لوگ اُس کے ساتھیوں کے پاس بیٹھے ٹائپ کرا رہے تھے۔ میں نے سوچا۔ اگر اس جگہ زائد معاوضہ لیا جا رہا ہوتا تو لوگوں کا رش یہاں کبھی نہ ہوتا۔ ''اچھا ٹھیک ہے'' میں اسٹول پر بیٹھ گیا جو اُس کے پہلو میں بائیں جانب پڑا ہوا تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا ذرا سے کام کے لیے۔۔۔۔'' میں بڑبڑایا۔

''اس نے اپنی کتاب پھر میز پر رکھ دی اور بولا۔'' جناب آپ ذرا مہنگائی دیکھیں کہاں جا رہی ہے؟'' میں نے کہا ''ہاں ___ دیکھ رہا ہوں اور اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ اس کے ذمہ دار ہمی آپ ہیں۔ ہمارے ہاں اب دیانت داری کہاں ہے۔ سب لوٹنے کھسوٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ دوسروں کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ جدھر دیکھتا ہوں بے حسی ہے۔ بجلی کا ایک بٹن تبدیل کرنے کے لیے الیکٹریشن نے ابھی کل مجھ سے پچاس روپے وصول کیے تھے۔ ذرا بتائیں یہ کوئی مناسب بات تھی؟'' میرا غصہ بڑھ رہا تھا اور لوگوں کے لیے میرے دل میں موجود زہر لفظوں سے اُترنے لگا تھا۔ میں ابھی کہنے ہی والا تھا کہ یہ بے جا طور پر رقم اینٹھنے والوں کو میں پکا حرام خور سمجھتا ہوں۔ میرا بس چلے تو ایسے تمام لوگوں کو دریا بُرد کر دوں مگر اسی لمحے اس نے مجھ سے کہا ''لائیے فارم نکالیں۔''

میں نے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے اس بڑے سے زرد لفافے کو اس کی میز کے ساتھ جڑی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ میں نے اُس کے اندر سے وہ دونوں فارم نکالے جو اُردو میں تھے۔ پھر جن کے کوائف دوسرے فارموں پر انگریزی میں مجھے ٹائپ کرانا تھا۔ ساتھ ہی بلینک پروفورمے بھی نکالے۔ اس نے مجھ سے یہ فارم لے کر اپنے دائیں جانب رکھ لیا۔ تھر اس نے خالی پروفورمے کو ٹائٹ رائٹر پر چڑھایا۔ اس خیال سے کہ اردو سے انگریزی میں لکھتے ہوئے ناموں کے ہجے میں غلطی نہ ہو۔ میں نے کہا ''میں ایک کاغذ پر ناموں کو انگریزی میں لکھ دیتا ہوں تا کہ غلطی نہ ہو۔ آپ ذرا مجھے کوئی سادہ کاغذ دیں۔'' اس نے دائیں طرف کی دراز کھینچی وہاں سے ایک سادہ کاغذ نکال کر مجھے دے دیا۔ میں نے اپنے لفافے کے اوپر کاغذ رکھ دیا اور تھوڑا سا آگے کھسک گیا۔ تبھی خیال آیا کہ میرے پاس کوئی قلم وغیرہ بھی نہیں ہے۔

میں نے کہا ''کوئی قلم بھی دیں'' اُس نے اپنی جیب میں اڑسا ہوا ایک قلم نکالا اور مجھے دے

دیا۔ یہ بال پوائنٹ نہ تھا بلکہ ایک فاؤنٹین پین تھا۔ میں نے کیپ کھولی اور اوریجنل سے جو قریب ہی رکھا ہوا تھا۔ سادے کاغذ پر ترتیب سے تمام نام انگریزی میں لکھنے لگا۔ اُس نے پہلے نام براسگاہ ذات ی اور ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ صرف تین نام تھے۔ تین چار منٹ میں یہ فارم ٹائپ ہو گیا۔ اس نے اسے مشین سے اُتار کر فولڈ کیا اور سائیڈ ٹیبل پر سامنے کی طرف رکھ دیا۔ اس نے دوسرا فارم مشین پر چڑھایا۔ اس میں بھی چند نئے ناموں کے ساتھ وہی پرانے نام تھے۔ اس نے ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ اسی فارم کو ٹائپ کرنے میں کوئی آٹھ دس منٹ لگے۔ اس نے اسے بھی اُتار کر پہلے والے فارم کے اوپر رکھ دیا اور بولا ''صرف ناموں کی اہمیت ہوتی ہے بقیہ کے ہجے کچھ ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے ٹائپ شدہ فارموں کی طرف دیکھا اور جھنجھلاہٹ سے بولا ''عجب حال ہے ہماری ملکی مشینری کا۔ ہمارے ہاں انگلش سے سبھی واقف ہیں۔ اردو میں دستاویز جاری کرنے کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ خوامخواہ پریشان ہونا پڑتا ہے۔ شناختی کارڈ دیکھو۔ اردو میں ہے۔ جبکہ اس کی تاریخیں انگریزی میں ہیں۔ نمبر انگریزی میں ہیں اور نام اردو میں لکھے ہوں۔ کسی باہر ملک میں دینا ہو تو وہ انگریزی ترجمے کا مطالبہ کرتے ہیں۔''

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی اور بولا ''ذرا ایک نظر فارموں پر ڈال لیں'' میں نے چپ ہو کر فارموں کو سرسری دیکھا۔ ''ٹھیک ہیں'' میں نے کہا۔ حالانکہ ٹھیک نہ تھے۔ یہ مجھے بعد میں نظر آیا تھا کہ ایک گواہ کی ولدیت میں غلطی تھی۔ مگر بقول اس کے اس کی اہمیت نہ تھی۔ ''اچھا۔ بس اسے اٹسٹ کرا کے لاتا ہوں'' اس نے کہا۔ وہ چاروں فرام لے کر کرسی سے اُٹھ گیا اور دکان کے اس کونے میں گیا جدھر میز پر کوئی وکیل صاحب نوٹیری پبلک کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ میں نے اپنی جگہ سے دیکھا۔ انہوں نے کاغذات پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔ پھر تیزی سے اس جگہ دستخط کرنے شروع کر دیئے جہاں اس کا خانہ تھا۔ انہوں نے اسی تیزی سے ان پر مہریں لگا ہیں۔ دکان میں Brisk Business جاری تھا۔ ہر میز بھری ہوئی تھی۔ لمحہ بھر میں وہ آدمی میرے کاغذات کے ساتھ پلٹ آیا اور چاروں فارم مجھے دے دیے۔ کام مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ تقریباً پچیس منٹ لگے تھے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا اور اُس کی سمت بڑھایا جواب اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ مجھے ان کاغذات کی ایک فوٹو کاپی کی ضرورت بھی ہے۔

میں نے اس سے کہا ''برائے کرم آپ ان دونوں فارموں کی ایک ایک فوٹو کاپی بھی کرا دیں۔'' یہ دو کاپیاں تھیں۔ صرف دو روپے میں بنتی تھیں۔ اس نے نوٹ میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولا ''کاپیاں آپ خود کرا لیجیے گا'' اور اپنی میز کی دراز کھولنے لگا۔ اس کی رکھائی پر میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ دراز کھول کر وہ چینج نکالنے لگا۔ میں اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر میں نے بھی رخصت کی تیاری کی اور سائیڈ ٹیبل پھلینے اپنے کاغذات سمیٹ کر اپنے بڑے لفافے میں رکھنے شروع کر دیے۔ میں نے وہ کاغذ بھی جس پر میں نے نام لکھے تھے کسی خیال کے تحت دوسرے کاغذات کے ساتھ لفافے میں

ڈال لیا۔ پھر میں نے میز پر نظر ڈالی۔ اطمینان کیا کہ تمام چیزیں میں نے لفافے میں رکھ لی ہیں۔ اس دوران وہ شخص چینج نکال چکا تھا۔ اس نے مجھے چار سو کے نوٹ واپس کر دیے۔ نوٹوں کو جیب میں رکھتے ہوئے میرا جی چاہا کہ چلتے چلتے اسے ایک دو باتیں سنا دوں مگر پھر کسی خیال سے میں چپ رہا۔ اسٹول سے اُٹھا اور اس سے مزید کچھ کہے سنے بغیر دکان سے باہر چل دیا۔ باہر نکل کر میں سڑک کی طرف بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک سوچ نے مجھے روک لیا۔ میں ذرا آگے بڑھ کر اسی طرح کی ایک دوسری دکان میں داخل ہو گیا۔ میں نے وہاں کے ایک آدمی سے بات کی اور جو کام میں کرا کے آیا تھا۔ اس کا معاوضہ اس سے دریافت کیا۔ اس نے کہا ''اسّی روپے پڑیں گے۔'' میں نے کہا ''یہ رقم زیادہ ہے'' اس نے کہا ''ہم اس میں آپ کو فارم بھی دیں گے اور تصدیق بھی کروائیں گے۔''

میں نے نفی میں گردن ہلائی اور چلنے لگا۔ اس نے کہا ''اچھا آپ ستر روپے دے دیجیے گا'' میں رُک گیا۔ اس نے مزید کہا ''اس رقم سے کم میں کوئی نہیں کرے گا۔ یہ کم سے کم ہے۔ آپ جہاں چاہیں معلوم کر لیں۔ میں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ میں ابھی کاغذات لے کر آتا ہوں'' اور وہاں سے نکل سڑک کی طرف چل دیا۔ مجھے اُس مقطع ٹائپسٹ پر سخت غصہ آ رہا تھا جس نے مجھ سے تقریباً پچیس تیس روپے زائد وصول کر لیے تھے۔ یہ بے اُصولی اور بے ایمانی کی حد تھی۔ ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں۔۔۔

میں نے سڑک پر آ کر ایک گذرتی ویگن کو ہاتھ دیا۔ یہ میرے گھر کی طرف جاتی تھی۔ اسٹاپ نہیں تھا یہ مگر ڈرائیور نے بس آہستہ کر دی۔ میں لپک کر اس میں چڑھ گیا۔ اندر کچھ سیٹیں خالی تھیں۔ ایک ہر بیٹھ کر میں نے سکون کی ایک دو سانسیں لیں۔ ''ٹھگ کا بچہ'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ میرے ذہن میں یہی مقطع سا آدمی تھا جس سے میں نے فارم ٹائپ کرائے تھے۔ اس کے بعد میں نے ہاتھ میں دبے زرد لفافے کو گود میں رکھا اور اس کے منہ کو کھول کر اس کے اندر جھانکا۔ وہ دوسرے کاغذات کے ساتھ اندر موجود تھا۔ یہ کوئی قیمتی چیز ہرگز نہ تھی مگر پھر بھی۔۔۔

میں نے لفافے میں ہاتھ ڈال کر اسے باہر نکالا اسے دیکھا اور دوبارہ لفافے میں ڈال دیا۔ میں نے اسے کچھ سوچ کر اپنے دوسرے کاغذات کے ساتھ لفافے میں اُس وقت ڈال لیا تھا جب وہ شخص میز کی دراز سے چینج (change) نکال رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی قیمت پچیس تیس روپے ضرور تھی۔ یہ کوئی قلم تھ جو اُس نے مجھے نام لکھنے کے لیے دیا تھا۔

خالد فتح محمد

وراثت

تمام پنچ خاموش بیٹھے تھے!

کچھاؤ کی لکیریں سب کے چہروں پر کھچی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی کیفیت چھپانے کے لئے بار بار گلا صاف کرتے یا زمین پر پاؤں رگڑتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ پنچ اس طرح خاموش بیٹھے رہیں، ہمیشہ کسی نہ کسی کے پاس سنانے کو کوئی نہ کوئی دلچسپ قصہ ضرور ہوتا ہے۔ حقے کی نے ایک ہاتھ سے دوسرے تک لگاتار چکر کاٹ رہی ہوتی۔ اِس کے علاوہ ایسی مجالس سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اِرد گرد بیٹھے ہوتے۔ وہ بھی پنچوں کے قصے کہانیوں کو غور سے سنتے اور مناسب موقع پر اپنی بھی کہہ دیتے۔

مگر آج تمام پنچ خاموش تھے۔ غیر متعلقہ لوگ دُور ہی سے اُن کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اپنے اپنے اندازے لگا رہے تھے۔۔۔ پنچایت، سرپنچ کی درخواست پر بلائی گئی تھی۔

چودھری نبی بخش نے خضاب سے اپنی مونچھیں گہری سیاہ کر کے آئینے میں چہرہ دیکھا۔ اُس کی بیوی ابھی تک سکتے میں تھی۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ جمال اُسکی زندگی میں اُس سے الگ ہو جائے گا۔ اُس نے جمال کی آخری رسومات میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ صرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر ایک کو دیکھتی رہی۔ لگ رہا تھا کہ وہ کسی کھوئی ہوئی شے کو چوری چھپے ڈھونڈ رہی ہے۔

چودھری نے جمال کو قتل ہونے کے دو گھنٹے بعد ہی دفن کرا دیا تھا۔ اُس نے پوسٹ مارٹم کرانا نہ پولیس کو اطلاع دی اور ارادتاً قانونی تقاضوں کو نظر انداز کیا۔ قاتل کسی سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ جمال کو اپنے وفادار دوست اور مزارع محمد دین کے بیٹے نے قتل کیا تھا۔۔۔

اُس نے آئینے میں مونچھوں کی جڑوں کو غور سے دیکھا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ ہر بال جلد کی سطح تک رنگا گیا ہے تو اُس نے آئینہ پرے کیا۔۔۔ اُس نے احتیاط سے پگڑی سر پر رکھ کر ایک دفعہ پھر آئینہ دیکھا، باہر نکلتی آہ کو اندر کے کنوئیں میں ڈبویا اور اکڑ کر پنچایت کی طرف چل پڑا۔

اُسے یک دم خیال آیا کہ وہ بالکل اکیلا ہے۔ جمال قتل ہو گیا تھا اور محمد دین، قاتل کا باپ تھا۔ وہ اپنے دُکھ میں کسے شریک کرتا! فاطمہ اور وہ زندگی بھر اپنے اختلافات ایک دوسرے پر واضح کرتے رہے تھے۔ جمال کے قتل کے بعد وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی اور چودھری کے اپنے اندر ایک تنور دہک رہا تھا۔ وہ اس شش وپنج میں تھا کہ اس تنور کو اب کون ٹھنڈا کرے! وہ جانتا تھا کہ اُس کی آنکھیں اُن بادلوں کی طرح ہیں جو برستے تو نہیں لیکن کسی بھی لمحے طوفان لا سکتے ہیں۔ گاؤں کا سربراہ ہوتے ہوئے وہ چاہتا تھا کہ اِس کٹھن وقت پر اُس کا کوئی ردِعمل کمزوری کی چغلی نہ کھائے۔۔۔ اُس نے ایک دفعہ پھر پگڑی کو درست کیا۔

محمد دین کا چہرہ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔۔۔ کھسیانی سی مسکراہٹ اور لہجے میں

مصلحت کی روانی۔ محمد دین کا یہی نقشہ اُس کے آئینہ خانے میں تھا۔ وہ دونوں ہم عمر تھے۔ چودھری نے سوچا کہ اُسے پنچایت میں محمد دین سے پہلے نہیں جانا چاہیے۔ محمد دین اگر بعد میں آیا تو نبی بخش کو اُسے دیکھنا پڑے گا۔ وہ اپنے جذبات کسی پر واضح نہیں کرنا چاہتا مبادا کہ مصلحت کی بھول بھلیوں میں وہ کسی اندھیرے موڑ پر رستہ گم کر دے! محمد دین کے بیٹے افضل نے جمال کو قتل کیا تھا۔ کیا یہ قتل غیرت کے نام پر کیا گیا یا اُس کے پیچھے کوئی منصوبہ تھا! چاہے کچھ بھی ہو اُس کے وسیت میں قتل کا بدلہ ضرور لیا جاتا ہے۔ وہ گاؤں کا سربراہ ہے اور تمام پنچ اُس کی خواہش کو اُسی فیصلے میں بدلیں گے جو وہ چاہتا ہے لیکن کیا اِس طرح بدلہ چکایا جا سکے گا؟ اگر اُس نے قتل کا بدلہ قتل ہی سے لینا ہے تو افضل ابھی تک اپنے گھر میں چھپا ہوا ہے۔ وہ پولیس کو اطلاع کر کے افضل کو گرفتار کرا سکتا تھا لیکن اُس نے ایف آئی آر درج نہیں کرائی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ محمد دین نے وہ درانتی، جس سے افضل نے جمال کو قتل کیا تھا، ضائع کرا دی ہے۔ آلۂ قتل کے بغیر جرم ثابت کرنا خاصا مشکل کام ہوتا ہے اور جمال کا پوسٹ مارٹم بھی نہیں ہوا تھا۔ اُسے خدشہ تھا کہ پولیس حقائق کو جاننے کے لئے یا محمد دین کا وکیل، استغاثہ کے موقف کو غلط ثابت کرنے کے لئے قبر کشائی چاہے گا۔ اگر یہ ہو گیا تو اُس کا خاندانی وقار خاک میں مل جائے گا۔۔۔

وہ واپس گھر پلٹ آیا اور پنچوں کے بلاوے کا انتظار کرنے لگا!

چودھری نے جمال کے قتل تک زندگی اپنے ڈھنگ سے گزاری تھی۔ اُسے شکار کا شوق تھا۔ وہ جنگلی جانور اور عورتیں شکار کرتا۔ محمد دین ہمیشہ اُس کے ساتھ ہوتا۔ اُس نے عورت ہی کو زندگی سمجھا۔ سنوانی جسم کے پرے اُس کی سوچ مفلوج ہو جاتی۔ وہ جوانی کے زہر کا تریاق عورت کے جسم میں ڈھونڈتا۔ وہ جانتا تھا کہ اُس کے اِس جنون کی تکمیل محمد دین ہی کے ذریعے ہوتی تھی۔ دونوں کا ساتھ لڑکپن سے تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر گہرے دُکھ میں ڈوبا مسکراہٹ کا سایہ سا نمودار ہو کر غائب ہو گیا۔ اُس نے اچانک خود کو اندر سے خالی محسوس کیا۔ اُسے لگا کہ جو سانس باہر گیا ہے، واپسی پر شاید اندر کے خلا کو نہ بھر سکے۔ محمد دین اور وہ ہمیشہ ساجھے دار رہے تھے۔ بہت عرصے پہلے لڑکے رات کو آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ تمام دو دو کی ٹولیوں میں ہوتے۔ محمد دین اور وہ ہمیشہ ایک ٹولی ہوتے۔ باری دینے والوں کو کسی مخصوص گھر کے چولہے سے راکھ لانے کو کہا جاتا۔ وہ راکھ لینے جاتے تو باقی لڑکے بہت دور بھاگ جاتے۔ پوری رات میں صرف ایک ہی ٹولی اپنی باری نمٹا سکتی۔ جب اُس کی باری آتی تو اُنہیں محمد دین کے گھر سے راکھ لانے کو کہا جاتا۔ یہ بھی کھیل کا حصہ تھا۔ محمد دین کے گھر میں تو چولہا ہی نہیں تھا۔ اُس کے والدین مر چکے تھے اور وہ چودھریوں کے گھر کھانا کھاتے تھا۔

آغازِ شباب ہی سے محمد دین کا گھر چودھری نبی بخش کے لئے جائے عیش بن گیا!

محمد دین اُس کا راز دان اور محافظ تھا۔ نبی بکش کے سحر یا دبدبے کے ناکام ہونے پر محمد دین ایک طویل مصالحتی سفر پر روانہ ہو جاتا۔ وہ اپنے چودھری کی دریا دلی، فیاضی، بہادری اور ذہانت کے من گھڑت قصے بیان

کرتا۔ایک وقت آتا کہ عورت موم ہونا شروع ہوجاتی۔اُس مقام پر چودھری کی ہوس کی رسی میں مجبوری کی ایک اور گرہ کا اضافہ ہوجاتا۔اِس گرہ میں ایک کانٹا تھا جو کبھی کبھار، سہلاتے ہوئے، نبی بخش کو چبھ جاتا۔اُس کے ہاتھوں کی جلد اتنی کھردری تھی کہ وہ اِس چبھن کو محسوس نہ کرسکتا تھا۔۔۔ایک غریب عورت ایسی تھی جو رسی میں گرہ نہ بنی۔محمد دین کے بہلاوے بھی کام نہ آئے تو نبی بخش نے اپنے تئیں ترپ کی چال چلی اور اُس عورت سے محمد دین کی شادی کرادی۔۔۔ ناکامی میں ڈوبی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کو ٹیڑھا کرگئی!

محمد دین نے گھر کے دروازے بند کر کے زُہرہ کے گرد حفاظت کی فصیل بلند کردی!

چودھری بے چین ہونا شروع ہوگیا۔وہ جانتا تھا کہ پولیس کو جمال کے قتل کی اطلاع ہوچکی ہے۔متعلقہ اہلکار اُس کے اشارے کے منتظر تھے۔اُس کا اندازہ تھا کہ پولیس رات کو کسی بھی وقت آسکتی ہے۔وہ اُن کے آنے سے پہلے اپنے مقدمے کا فیصلہ کردینا چاہتا تھا کیونکہ پس کے ہاں قتل کا بدلہ قانونی تقاضوں کی طرح مرحلہ وار نہیں ہوتا۔

اُس کی نظر اپنی بیوی پر پڑی تو زہرہ دوبارہ وہاں جلوہ گر ہوگئی۔محمد دین نے زہرہ کے گرد اُٹھائی فصیل میں درز بھی نہ چھوڑی تھی۔چودھری کو محمد دین کے ساز وسامان میں بے وفائی کا ہتھیار کہیں بھی نظر نہ آیا۔وہ اُسی طرح اُس کا وفادار اور چارہ گر رہا۔چودھری نے اُسے کاشت کرنے کے لئے دس ایکڑ رقبہ دے دیا۔محمد دین نے اپنی زندگی کو تین حصوں میں تقسیم کردیا۔وہ چودھری سے وفاداری نبھاتا، زہرہ کے تقدس کی حفاظت کو فرض جانتا اور زمین کی کاشت میں اپنا خون پسینہ ایک کرتا۔چودھری کو دونوں کی زندگیوں میں آج پہلی دفعہ فرق محسوس ہوا تو اُسے اپنے اندر کے کسی تاریک گوشے میں سے نفرت کے ناگ کی شوکر سنائی دی۔اُس نے ناگ کے سر کو کچلنے کا فیصلہ کیا مبادا کہ نفرت، بدلے کے جوش کو کسی اور سمت لے جائے۔اُسے اچانک محسوس ہوا کہ تمام شان وشوکت اور جنسی مہم جوئی کے باوجود اُس نے ناکام زندگی گزاری ہے۔اُس کے آگے کوئی نصب العین نہیں تھا۔ایک عورت، دوسری عورت، تیسری عورت۔۔۔وہ کہاں تک گنتا اور پھر۔۔۔اُس کے بعد کچھ نہیں۔اُس کی زندگی ایک دائرہ تھی جس کے اندر عورتوں کے بے ترتیب جسم گھومتے تھے۔اُسے دائرے میں خالی جگہیں نظر نہ آئیں مگر آج وہ جسم بھی وہاں موجود نہیں تھے۔دائرہ اندر سے اُس کی طرح خالی تھا اور باہر ہر سو محمد دین! محمد دین کے گھر سے راکھ لانا ایک مزاق تھا۔آج اُس کے گھر میں زندگی تھی۔چولہے میں راکھ کے ساتھ کوئلے بھی تھے۔اگر کوئی راکھ مٹھی میں بھرتا تو کوئلے اُس کا ہاتھ جلادیتے۔۔۔

یہی جمال کے ساتھ ہوا!

چودھری نے زُہرہ کے حصول کے لئے کی ہتھکنڈے استعمال کئے۔محم دین بدھو تھا یا اتنا کایاں کہ اُس کے ہر وار کو اپنی مسکراہٹ کے کھسیانے پن کی ڈھال سے بے اثر کردیتا ہے۔اُس وقت وہ اپنی ناکامی کو غیر اہم واقعہ سمجھتا تھا لیکن آج وہی ناکامی اُس کا منہ چڑانے لگی۔اُسے لگا کہ اُس کے ٹکڑوں پر پلنے والا محمد دین اُسے ہر بازی میں مات دیتا آیا ہے۔ہر وہ عورت جو اُسے رد کردیتی تھی، محمد دین اپنی

ذہانت اور موقع شناسی کی بدولت اُس تک پہنچا دیتا۔چودھری کو یقین ہوگیا کہ محمد دین اُسے بیوقوف بناتا آیا ہے۔محمد دین نے اُس کی سادگی کے پیکر میں آخری وار اپنے بیٹے سے کرایا۔جمال اُس کی اکلوتی اولاد تھا۔اُس کا بدلہ کون لے گا؟ اُس کا کوئی بھائی یا بھتیجا نہیں تھا۔اگر ہوتا بھی تو اُس نے اُنہیں اپنے اِس معاملے میں شریک نہیں کرنا تھا۔کیونکہ وہ بدلے سے زیادہ وراثت میں دلچسپی رکھتے۔وہ اُن کے اقدام سے شاید مطمئن نہ ہوتا۔اُس نے اپنے بھانجوں کو بھی اطلاع نہ دی۔وہ اپنا حساب خود چکانا چاہتا تھا۔

چودھری نے اپنے ایک کارندے کو محمد دین کے بارے معلوم کرنے کے لئے پنچایت میں بھیجا۔ اُسے تاخیر سے اُلجھن ہونے لگی تھی۔وہ جانتا تھا کہ افضل اپنے گھر میں موجود ہے۔قتل حویلی میں ہوا تھا۔کچھ عرصے سے جمال کا محمد دین کے گھر آنا جانا تھا اور اُسے اِس آمدورفت کی وجہ معلوم تھی۔اُس کے اپنے رنگین افسانے ابھی لوگوں کی یادوں سے محو نہیں ہوئے تھے کہ جمال بھی اُسی ڈگر پر چل نکلا۔نبی بخش نے اُسے منع نہیں کیا۔اُس اپنے گرد اطمینان کی ایک غیر مرئی چادر لپٹی محسوس ہوئی۔وہ خاندان کے اِس شوق کے تسلسل پر خوش تھا۔ افضل کو محمد دین نے محنت کی عادت ڈال دی تھی۔وہ اپنے اِردگرد سے بے خبر صرف اپنے کام میں دلچسپی رکھتا۔

محمد دین اور اُس کی بیٹی جمیلہ رات کے اندھیرے میں اُسے ملنے آئے! اُس نے تھوڑی دیر قبل جمال کو دفن کیا تھا۔وہ اُن سے کیوں ملا؟ شاید اُس وقت وہ کمزور ہوگیا تھا یا سکتے کی حالت میں تھا۔اب اُس نے سوچا کہ محمد دین کو ماتم پُرسی کے لئے بیٹی کے بجائے بیوی کو لانا چاہیے تھا۔حالات نے اُن دونوں کے درمیان ایک خندق پیدا کردی تھی۔اُسے خیال آیا کہ محمد دین ہمدردی کے بہانے میں اُس کے ساتھ ہمیشہ دھوکہ کرتا آیا ہے۔وہ اپنے تئیں خلوص کے رنگوں میں گھر احمد دین کی مکاری کی بے رنگی کو شناخت نہ کرسکا۔وہ تعزیت کے لئے بھی اپنی بیوی کو ساتھ نہ لایا۔اُسے اُس کی زندگی کے اِس نازک موڑ پر زہرہ کو ساتھ لانا چاہیے تھا۔وہ یہاں بھی مکاری کی چادر میں لپٹا آیا۔پھر اُس نے سوچا کہ محمد دین کے دِل میں اگر میل نہ ہوتی تو وہ جمال کی نمازِ جنازہ میں شرکت کرتا۔اُسے دوسروں کو بہلا پھسلا کر بات منوانے کا ڈھنگ آتا تھا۔پُرسے کے لئے وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لایا۔بیٹی بھی باپ کی طرح مکاری کے جادو سے آشنا تھی۔اُس کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ کے بجائے جوانی کی مٹھاس تھی۔جمیلہ نے اعتراف کیا کہ اُسے جمال سے کوئی رغبت نہیں تھی۔وہ اپنی خواہش کو اُٹھائے جمیلہ کے پاس آتا۔۔۔جمال کو معلوم تھا کہ گرمی سے بچنے کے لئے وہ دوپہر چارے والے ڈھارے میں گزارتی ہے۔اگلے دن اُس کا بھائی حویلی ہی میں تھا کہ جمال آگیا۔ہمیشہ کی طرح وہ۔۔۔لیکن جمیلہ کو اپنے بھائی کی موجودگی کا علم تھا۔اُس نے شرارتاً ہلکا سا احتجاج کیا جو افضل کے کانوں تک پہنچ گیا۔۔۔اور افضل نے آتے ہی جمال کے پیٹ میں درانتی سے پے در پے وار کردیئے۔

محمد دین کے چولہے میں راکھ کوٹولتے جمال کو کوئلوں سے ہاتھ جلا بیٹھا اور چھالے نبی بخش کے ہاتھوں میں بنے!

چودھری حیران تھا کہ ذاتی دُکھ اور نفرت کے باوجود وہ جمیلہ کی باتوں میں کیوں گم ہوگیا تھا۔

اُسے تمام واقعے کا پہلے سے علم تھا مگر اپنے بیٹے کے قتل ہونے کی تفصیل انجان بن کر سنتا رہا۔۔۔محمد دین کا جِن جمیلہ کے اندر بھی زندہ تھا۔ اُس کے بیان میں اپنے باپ کا گمراہ کن سحر تھا۔ وہ بولے جا رہی تھی اور چودھری اُس کے لفظوں کے گنجلوں میں اُلجھتا رہا۔۔۔اُسے یاد آیا کہ وہ کچھ وقت کے لئے بدلے کے بارے میں بھول گیا تھا۔۔۔اُس نے پھر سوچا کہ وہ خوان کا بدلہ خون سے لے یا یہ کام پولیس اور قانون کے سپرد کر دے۔ کیا وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ گمراہ قانون کے ہاتھوں میں اپنا سچ تھما دے۔ محمد دین سے اُس نے ایک نہیں بلکہ دو سے زائد قتلوں کا بدلہ لینا ہے۔ افضل نے اُس کے بیٹے کو قتل کیا ہے۔ جمیلہ، محمد دین کی بیٹی ہے اور وہ زُہرہ کے پیٹ میں پلی ہے۔۔۔کسی نے آ کر بتایا کہ محمد دین پنچایت میں پہنچ گیا ہے!

نبی بخش اُسی طرح بیٹھا رہا۔ اُس نے سوچا کہ وہ ماہر شکاری ہے اور محمد دین اُس کے نشانے کی درستی سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ خون کا بدلہ خون سے لے گا۔ اُس نے سوچا کہ جمال کے قتل کی اصل محرک جمیلہ ہے۔ وہ اگر جمال کی خواہشوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی تو افضل کو اس واقعے کی خبر ہی نہ ہوتی۔ اُسے جمیلہ سے بھی بدلہ لینا چاہیے۔ پھر اُسے خیال آیا کہ جمیلہ اِس واقعے کے ساتھ براہِ راست منسلک ہوتے ہوئے بھی اس میں شامل نہیں تھی۔ اُس نے تو سرسری سا احتجاج کیا تھا اور ایسا احتجاج تو عورت کے چرتر کا حصہ ہے۔ ممکن ہے کہ یہ محمد دین کا منصوبہ ہو! اُس نے نبی بخش کو زہرہ کے متعلق اُس کے عزائم کی سزا دی ہو۔ اِس سے بہتر سزا کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے واحد سہارے سے مرحوم کر دیا گیا۔ محمد دین کے اِس منصوبے کو زہرہ ہی پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کو جوان ہوتے ہی تمام چرتر آ جاتے ہیں لیکن جمیلہ کو مزاحمت کی ترغیب زہرہ ہی نے دی ہو گی۔ درانتی ڈھارے میں اِسی مقصد کے لئے رکھی گئی ہو گی ورنہ عموماً یہ دیگر اوزار کے ساتھ ہوتی ہے۔۔۔اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ چاروں کو گولی مار دے گا۔

چودھری نبی بخش نے دالان کے پیچھے کوٹھڑی میں جا کر پستول ڈَب میں رکھا اور ڈیرے کی طرف چل پڑا!

جمال کے قتل کے بعد اُس نے خود کو پہلی دفعہ صدمے اور اُلجھنوں سے آزاد محسوس کیا۔ اُس نے قدموں میں نرماہٹ اور چال میں توانائی محسوس کی۔ اُس نے سوچا کہ وہ ڈیرے میں مناسب وقت پر محمد دین کو گولی سے اُڑا دے گا اور پھر باقی تینوں کو۔

ڈیرے پر چار چارپائیاں بچھی تھیں۔ تین پر چھ پنچ بیٹھے تھے۔ اُس کے لئے چارپائی خالی رکھی گئی تھی۔ محمد دین بڑے دروازے کی طرف پیٹھ کئے زمین پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنا حقہ ساتھ لایا تھا۔ چودھری کو اُس کی اس جرات پر بھی غور آیا کہ وہ اُس کا حقہ بھی استعمال کرنا نہیں چاہتا، پھر اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا کہ محمد دین جلد ہی ڈھیر ہونے والا ہے۔

چودھری نبی بخش ایک شانِ بے نیازی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ کُھلی فضا میں ایک کھچاؤ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا کھچاؤ ایک قدرتی بات ہے اور وہ ماحول کو اِسی طرح رکھنا چاہتا تھا۔ اگر اُس نے اپنے چہرے یا لہجے میں کوئی نرمی دکھائی تو وہ اپنی عزت کھو بیٹھے گا۔ اُس نے جب گفتگو کا آغاز

کیا تو اُس کے لہجے میں غرور، نفرت اور قدرے لاتعلقی تھی۔ اُس نے اپنی آواز سرگوشی سے ذرا اونچی رکھی تا کہ سب سن سکیں اور سرگوشی میں چھپی شوکر بھی محسوس کر لیں۔ اُس نے وہاں اکٹھے ہونے کا مقصد بتایا اور پنچوں کو تاکید کی کہ وہ فیصلہ کرنے کا حق اُسے دے دیں۔ پھر اُس نے پہلی دفعہ محمد دین کو دیکھا۔ وہ حقے کی نے ہونٹوں میں لئے بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ اور آنکھیں کسی قسم کے تاثر سے خالی تھیں۔ چودھری کا ہاتھ اچانک ڈب کی طرف گیا اور پھر وہاں سے نہ ہلا۔

سب سے پہلے محمد دین نے اپنا نقطہ نظر بیان کرنا تھا۔ اُس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ اُس کی آواز معذرت کی ہر پیچیدگی سے عاری تھی۔ اُس نے چودھری سے اپنے تعلق کی تفصیل بتائی۔ چودھری کے احسانات ایک ایک کر کے گنوائے۔ کہیں بھی کسی عورت کا ذکر نہیں تھا اور اگر تھا تو اُس کی اپنی بیوی زُہرہ کا۔ اُس نے بتایا کہ چودھری نے کم مایہ آدمی کو صاحب حیثیت بنایا۔ نہ صرف گاؤں میں بلکہ اِردگرد کے لوگوں میں بھی اُس کی شناخت بنائی۔ اُس کی مہربانی تھی کہ گاؤں کے اہم فیصلوں میں لوگ اُسے بھی شامل کرتے۔۔۔وہ بولے جا رہا تھا۔ کسی مقام پر نبی بخش اُس کی باتوں کے دھارے سے باہر نکل آیا۔ اُس نے سوچا کہ محمد دین جب قتل کا ذکر کرے گا تو وہ اُس کی آخری سانس ہو گی۔ لوگ جب محمد دین کی لاش کی طرف متوجہ ہوں گے تو وہ ہاں سے کھسک جائے گا۔ ویسے بھی کوئی اُسے روکے گا نہیں۔ وہ محمد دین کے گھر جا کر زہرہ، جمیلہ اور افضل کو گولی سے اُڑا دے گا اور اُس کے بعد۔۔۔کیا وہ خودکشی کرے گا؟ اُسے اچانک اپنی بیوی کا خیال آیا۔ وہ سکتے کی وجہ سے نیم پاگل تھی۔ اُس کی خودکشی کے بعد شاید مکمل طور پر ہوش کھو بیٹھے۔ اگر وہ خودکشی نہ کرے تو چار قتلوں کے بعد قانونی دسترس سے بچنا محال ہو گا۔ اِس تمام عمل میں اُس کی بیوی کی نگہداشت کون کرے گا۔۔۔اُس کا وارث بھی کوئی نہیں، صرف بھانجے ہیں۔ دونوں بہنوئی اُس کی جائیداد سنبھال لیں گے۔ اُس کی وراثت غیروں مین بٹ جائے گی۔۔۔کیا چاروں قتل ضروری ہیں؟ اُس نے سوچا کہ جمال بے گناہ تھا لیکن جمیلہ یا افضل کا بھی کوئی قصور نہیں۔ اُس نے اگر قتل کر دیئے تو وہ خود قتل کے بعد کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکے گا۔ پھانسی بھی بعید از امکان نہیں۔ اُسے دونوں بہنوئی اچانک دشمن اور غاصب لگنے لگے۔

نبی بخش نے محمد دین کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا! سب کی نظریں اُس کے چہرے پر تھیں۔ اُس نے ڈب سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اِس دفعہ اُس کے لہجے میں سانپ کی شوکر نہیں تھی۔ اُس نے واضح کیا کہ جمال کا قتل ضروری نہیں تھا۔ اِس کا کوئی اور حل بھی نکالا جا سکتا تھا۔ اب اُس کے پاس صرف دو راستے ہیں: افضل، محمد دین، جمیلہ اور زہرہ کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کرا کے اُنہیں تختہ دار تک پہنچا دے یا اپنے ہاتھوں سے چاروں کو ختم کر دے!۔۔۔مگر ہر حالت میں اُس کی جائیداد غیروں تک پہنچ جاتی ہے جو وہ نہیں چاہتا۔۔۔اُسے فکر ہے صرف اپنی وراثت کی۔ اُسے ایک وارث درکار ہے۔۔۔اور وارث حاصل کرنے کے لئے وہ اِن تمام ممکنات سے دست بردار ہو سکتا ہے!

اخلاق انصاری

سائے میں دھوپ

دیوار گیر کیلینڈر پر تیس کا ہندسہ کالی تحریر میں عیاں ہے۔ کیلینڈر پنکھے کی ہوا میں پھڑک رہا ہے۔ ایک کمرے میں تین اطراف رکھی آرام کرسیوں پر لیکچرر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سامنے بڑی میز کے عقب میں رِوالونگ چیئر پر پرنسپل صاحب اپنے پاؤں کے پنجوں کے بل کرسی کو شمالاً جنوباً آہستہ آہستہ گھماتے ہوئے مزہ لے رہے ہیں۔ وہ رہ رہ کر انگڑائی لیتے ہیں۔ آج تعزیتی اجلاس ہے، ایک لیکچر کم ہے اور سب کو اسی کا انتظار ہے۔ وہ جب تک آئے تب تک گپ شپ ہو رہی ہے۔

زولوجی کا لیکچر: سناؤ بھئی! تمہارا میڈیکل سٹور کیسے چل رہا ہے؟

کیمسٹری والا: بس یار! گزر بسر ہو رہی ہے۔

بوٹنی والا: یار! میں تو اس جنرل سٹور سے۔۔۔ تنگ آ گیا ہوں۔

سندھی والا: کیوں؟

بوٹنی والا: فائدہ ہی نہیں۔۔۔ بابا! پانی تو پلاؤ۔

چپڑاسی اپنی گدی کھجاتے گلاس کو دو مرتے دھوتا ہے پھر کولر سے بھر کر لے آتا ہے۔ وہ پورے گلاس کو دو گھونٹوں میں چڑھا لیتا ہے۔

سندھی والا: یار! اس سے تو راج مستری بھی زیادہ کماتا ہے، آٹھ گھنٹوں کے ۲۲۰ روپے لیتا ہے۔ رات کو نیند تو آرام کی کرتا ہے۔

بوٹنی والا: ہمیں تو نیند کی گولی سے بھی آرام نہیں ملتا۔

اکنامکس والا: چکر کیا ہے۔۔۔ سب کے سب چیخ رہے ہو؟

کھیل والا: زنانہ چکر ہے۔

سب لیکچرر قہقہہ مار کر ایک ساتھ ہنستے ہیں۔ اچانک قہقہے بند ہو گئے، یوں لگتا ہے جیسے سب کے سب باتھ روم میں پناہ لینے چلے جاتے ہیں۔ خاموشی چھا گئی، فزکس کا لیکچرر سلام کہہ کر چپ چاپ ایزی چیئر پر اپنے آپ کو گرا لیتا ہے۔ صاحب اپنی گھومتی ہوئی کرسی کو ایک جگہ ٹکا لیتا ہے۔

صاحب: آپ سب کو پہلے سے ہی پتہ ہے کہ ہمارے کلیگ پروفیسر شفیق کے بھائی کو کچھ دن پہلے بے گناہ قتل کیا گیا تھا۔۔۔ موت تو برحق ہے۔۔۔ لیکن ناگہانی موت کا دُکھ برداشت سے باہر ہوتا ہے۔۔۔ درحقیقت بندہ خدا کے آگے بے بس اور لاچار ہے۔۔۔ ہماری یہ میٹنگ ان کے ساتھ دُکھ میں شریک

ہونے کے لئے بلائی گئی ہے۔

پروفیسر شفیق کی آنکھوں میں پانی جھیل کی طرف بھر آتا ہے۔

اتنے میں کچھ طلبا آ جاتے ہیں۔

طلبا: سر! سٹوڈنٹس کلاس روم میں بیٹھے ہیں۔ کوئی ٹیچر پڑھانے کے لئے بھیجیں۔

صاحب: بیٹے! آج میٹنگ ہے، اس لیے کلاس نہیں ہوں گی۔

کیمسٹری والا: پہلے کون سے تیر مارے ہیں۔۔۔ آج انہیں پڑھانا یاد آیا ہے۔ آئے دِن جھگڑے۔ بائیکاٹ۔۔۔ ہونہہ!

طلبا واپس چلے جاتے ہیں۔

اسلامیات کے لیکچرر نے اپنی سرخ و سفید داڑھی کھجاتے ہوئے کہا: سائیں! فاتحہ پڑھیں۔

سب نے سروں کو رومال سے ڈھانپ لیا اور بدبداتے ہوئے کہتے ہیں، ''بھائی! جو خدا کی مرضی''، ''جو خدا کی مرضی''۔

سب لیکچررروں کی آوازیں مل کر پروفیسر شفیق کے کان میں گھس گئیں، شفیق نے تھوک نگلتے ہوئے کہا، ''سائیں! منظور ہے۔''

پھر خاموشی۔

زولوجی والا: تمہارا بیٹا کیسا ہے؟

کیمسٹری والا: اب بہتر ہے۔

صاحب: اللہ رحم کرے گا۔

کیمسٹری والا: سائیں! اب تو پتہ نہیں کیسی کیسی بیماریاں نکل پڑی ہیں، کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔

سندھی والا: بس، یار!۔۔۔ کیا کریں؟

کچھ لیکچرر اخبارات پڑھتے ہیں تو کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے مسکراتے ہیں۔

اکنامکس والا: سائیں! لگتا ہے کہ ہمارے ملک کے بجٹ کا گراف نیچے گر جائے گا۔

کھیلوں والا: چھوڑو یار! گرا تو ہم ہی اُٹھا لیں گے۔

سیاست والا: ہاں۔۔۔ بالکل اُٹھا لینا۔۔۔ ہاہاہا۔

صاحب نے کال بیل کے بٹن پر زور دیا تو جواباً میوزیکل بزر سے بلبل جیسی آواز نکلی۔

صاحب: بیٹے! چائے لے آؤ۔

فلسفہ والا: موت کیا ہے؟

اسلامیات والا: موت عربی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''فنا ہونا''۔

فلسفہ والا: زندگی کیا ہے؟

اسلامیات والا: روح ختم ہو جائے گی تو موت آ جائے گی۔

فلسفہ والا: روح بھی تو عربی لفظ ہے، اس کے معنی ہیں ''حرکت'' اور موت بھی عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ''کم ہونا''۔ ایک شعر ہے ؎

زندگی کیا ہے ، عناصر کی ظہور و ترتیب
موت کیا ہے ، ان اجزاء کا پریشاں ہونا

صاحب: بابا! یہ بہت بڑے مسائل ہیں، ان پر بحث مت کریں۔

سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ پھر بات نکل آتی ہے تنخواہوں کی، کچھ کہتے ہیں: بڑھیں گی، کچھ کہتے ہیں: دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

اکنامکس والا: ہاں صاحب! تنخواہیں بڑھ رہی ہیں؟

صاحب: ابھی تک نوٹیفکیشن نہیں آیا۔

سب کے سب پرنسپل صاحب کا جواب سن کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کے چہروں پر مایوسی پھیل جاتی ہے۔

کھیلوں والا: منہ خراب کرنے سے تنخواہیں تو بڑھے سے رہیں۔

اکنامکس والا: تنخواہ میں تو گزر ہی نہیں ہو رہا، کیا کریں؟ مسائل سے کس طرح نپٹیں؟

کھیلوں والا: منہ خراب کرنے سے مسائل کم نہیں ہوں گے۔ ہاں، اگر کم ہوں تو پھر منہ بھی خراب کریں۔ مود بناؤ، ایک لطیفہ سنو۔ ایک بچہ مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ ملا نے اسے کہا کہ بیٹے! اپنی ماں کو میرا اسلام کہنا۔ عورت اپنے شوہر سے ذکر کرتی ہے اور بیٹے سے کہتی ہے کہ ملا کو میرا اسلام کہنا اور اسے کہنا کہ شام کو گھر آئے۔ شام کو ملا گھر آیا، عورت نے اسے اندر بلایا۔ اتنے میں دروازہ کھڑکا۔ عورت نے ملا کو کہا کہ جلدی کرو، یہ برقعہ پہن لو اور چکی پیسنا شروع کر دو۔ عورت کا شوہر آیا تو اُس نے شوہر سے کہا، پڑوسن ہے بیچاری، پردہ دار ہے، ملا چکی پیستا رہا۔ ایک مرتبہ پھر ماں نے بیٹے سے کہا کہ ملا کو میرا اسلام کہنا۔ ملا نے جواب میں کہا: پھر آٹا کم پڑ گیا ہے کیا؟

ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ چپڑاسی اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ وہ سب کو ہنستا ہوا دیکھ کر خود بھی بغیر کسی سبب کے ہنس پڑتا ہے اور پھر سیدھا جا کر دیوار گیر کیلنڈر کا ورق پھاڑ کر اُتار لیتا ہے تو سرخ تحریر میں پہلی تاریخ نمایاں ہو جاتی ہے۔

کیلنڈر پنکھے کی ہوا پر سانس لیتا ہے۔ صاحب کی کرسی شمالاً جنوباً گھومتی ہے، پروفیسر شفیق آہستگی کے ساتھ چپڑاسی کو کہتا ہے: بابا! پانی تو دینا۔

شفیق نے بھرے ہوئے گلاس کو ایک ہی سانس میں ختم کر لیا۔ اس کے آنکھوں کی جھیل، اُمڈ کر پپوٹوں کے پشتے توڑتی ہوئی بہنے لگی۔

اخلاق انصاری

زندگی کی طرف

دو دِن قبل اُس کا کتا مر گیا تھا۔

وہ جو باتونی مشہور ہے، اس کے مشاغل میں شامل ہے کتابیں پڑھنا، بحث مباحثے کرنا، بیڈمنٹن کھیلنا اور چھٹی کے دنوں میں دوستوں کی دعوتیں کرنا اور شطرنج کھیلنا، کچھ وقت نکال کر تین سالہ بیٹے کو کہانیاں سنانا۔ اب دو دنوں سے خاموش ہے۔ اس کی بیوی بھی اس سے دور دور رہتی ہے۔ اسے آفیس میں بھی مزہ نہیں آتا۔ وہ آفس سے گھر آ کر بیڈروم میں لیٹ جاتا ہے۔

آج اس نے اپنے بالوں کو دیکھا، انہیں کلر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔۔۔ وہ بالوں کو کلر کر کے صوفے کے بازو پر پلاسٹک شیٹ بچھا کر اس پر سر رکھے سو جاتا ہے۔ اس کے سرہانے شیلف ہے جس پر اس کے بیٹے کا ایک بڑا فوٹو فریم شدہ پڑا ہے جو اِس نے اُس کی سالگرہ کے دِن کھینچا تھا۔ شیلف کے دوسرے حصے میں موہن جوداڑو کے ''پرسیٹ'' کا مجسمہ ہے، جو پلاسٹر آف پیرس کا بنا ہوا ہے اور شیلف کے اوپر پلاسٹک کے پھول گلدان میں رکھے ہوئے ہیں جن پر دھول کی دبیز تہہ جم گئی ہے۔ وہ سوچتا ہے، ''پرسیٹ'' آنکھیں بند کیے بڑے 'آنند' سے بیٹھا ہوا ہے، پھر اسے لگتا ہے کہ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے، شاید عبادت کر رہا ہو یا پھر ہو سکتا ہے کہ چونکہ اس کے چہرے پر ایک معصومیت بھری پریشانی اور سوچ ہے۔ لہٰذا وہ اس وقت اپنی رعایا کے لئے سوچ رہا ہو۔۔۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں اسے اچھی نہیں لگتیں۔ اس کا سترہ سالہ کاٹو بوائے سٹائل بیٹا اپنی سپورٹس بائیسکل کی مرمت کر رہا تھا۔ وہ خاموش ہے اور خاموش رہنا بہتر سمجھتا ہے۔ اگر کچھ کہے گا تو پورے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔

وہ تین دن پیشتر اپنے ایک دوستے کے بیٹے کی شادی پر باہر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو اس کا ''بوڈل''، نسل کا کتا بیمار تھا، کتا ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ اس کی بیوی نے کاہلی سے کام لیتے ہوئے کتے کو دودھ اور ڈبل روٹی کی بجائے مچھلی کھلا دی جس کے سبب اسے قے ہونے لگی۔ وہ جو کچھ بھی کھاتا یا پیتا، سب کا سب کر کے باہر نکال دیتا۔

وہ کتے کو لے کر حیوانات کے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ٹیکے، دوائیاں ہوئی لیکن کتا مر گیا۔ پھر اُس نے کتے کی سب چیزیں، بیڈ، بیلٹ، زنجیر اور کھانے والی پلیٹ گاڑی میں رکھیں اور جب گاڑی سٹارٹ کی تو اس کا دل بھر آیا۔ ایکسیلیٹر کی آواز کتے کے غرانے ایسی لگی۔ اُس نے عقبی آئینیں دیکھا تو اپنا گھر دھندلا سا نظر آیا۔

دو دنوں سے ٹی وی بند ہے، گھر میں خاموشی ہے۔ وہ صوفے کے بازو پر گردن ڈھلکائے اپنے منہ بڑبڑانے لگتا ہے۔

''پیارے موتی!''

ٹانکی سے قطرہ قطرہ پانی گرنے کی آواز اس کا دل چیرتی جاتی ہے۔

''تم کیوں جاتے تھے اُس باتھ روم میں؟

(اس کی آواز بھر آتی ہے)

''تمہارا میرے پاؤں کو چاٹنا''

مجھے تنگ کرنا،

بھونکنا، اُچھلنا کودنا،

یاد کر کے میرا دل شدتِ غم سے پھٹا جا رہا ہے۔

وہ تیرا شاپنگ بیگ کے ساتھ کھیلنا،

مستی میں آ کر دوڑنا،

کان کھڑے کر کے غصہ کرنا،

مجھے یاد آتا ہے تو میرا دل کڑھنے لگتا ہے۔

کیا یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دوں کہ

''قسمت کا لکھا ٹل نہیں سکتا''

لیکن پھر بھی میرے دل سے غم کا غبار ہٹتا نہیں

میں اپنے آپ کو کس طرح تسلی دوں؟

کون مجھے تسلی دے؟

اس کی بیوی روٹی پانی اور چائے مقررہ وقت پر میز پر رکھ جاتی ہے۔

وہ گھر میں بیوی کی روزمرہ والی چخ چخ سے بچا ہوا ہے، ''سگریٹ بہت پی رہے ہو نا؟''

''نرگس تمہیں فون کیوں کرتی ہے۔۔۔؟''

''کیا چکر ہے؟''

وہ کسی کا بھی فون اٹینڈ نہیں کرتا۔ اس کی بیوی سب سے کہتی ہے۔ ''باہر نکل گیا ہے''۔۔۔

''سویا ہوا ہے۔۔۔'' اسے ریڈرز ڈائجسٹ میں چھپی کتے کی وہ کہانی یاد آتی کہ ایک کتا اپنے مالک کو سٹیشن چھوڑنے گیا تھا اور اس کا مالک ٹرین حادثہ میں مر گیا، لیکن کتا روزانہ سٹیشن جاتا رہا اور اس کتے کو بعد میں وفاداری کا عالمی ایوارڈ دیا گیا۔ اس کا مجسمہ بنا کر چوراہے پر لگا دیا گیا۔

وفاداریاں کیا ہیں؟ اس کا ذہن کام نہیں کر رہا۔ اسے وفاداری کی تشریح کرنا نہیں آ رہا۔ صرف

یہ سوچتا ہے کہ کتا مالک سے وفادار ہوتا ہے اور بلی گھر سے۔

سوچتا ہے: ''اب نہاؤں۔۔۔ بالوں کی دھوڑ الوں۔'' لیکن وہ بیوی کو پانی گرم کرنے کے لئے نہیں کہنا چاہتا۔ اس کا تین سالہ بیٹا جو کئی مرتبہ ڈرائنگ روم میں جھانک چکا تھا کہ شاید ابا پاس بلا کر کہانی سنائے، وہ بھی ہر مرتبہ مایوس ہو کر لوٹ گیا تھا۔ وہ انگڑائی لے کر پانی گرم کرنے کے لئے اُٹھتا ہے۔ دروازہ کھولتا ہے تو اس کا بیٹا مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں ایک طوفان سا اُٹھتا ہے، سوچتا ہے، ''اس بچے نے کیا قصور کیا؟''

وہ بچے کو اُٹھا کر بازوؤں میں بھر لیتا ہے تو بچہ روہانسا سا ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔ وہ آنسو صاف کر کے بیٹے کو سینے سے لگائے صوفے پر آ بیٹھتا ہے اور اسے کہتا ہے،

''بیٹے!۔۔۔ بیٹے!! کہانی سناؤں'' کہانی سنانا شروع کرتا ہے، ''ایک تھا فقیر۔۔۔''

اُس کا بیٹا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواباً کہتا ہے، ''فقیر کو ملی ایک گٹھڑی ___ گٹھڑی میں تھی مصری (چینی کی ڈلی) ___ آگے بات گیا میں بھول۔''

اور پھر فضا میں بڑے اور چھوٹے قہقہے پھیل جاتے ہیں۔

خاور اعجاز

اک غم میں جب دوسرا صنم ہو جاتا ہے
پہلا دُکھ کہتے ہیں کم ہو جاتا ہے

سیرِ چمن کو نطے ہو پر یاد رہے
جو آتا ہے سبز قدم ہو جاتا ہے

دیکھتا ہوں جب نم آلود نگاہوں سے
آنکھ پیالہ جامِ جم ہو جاتا ہے

ایک زمانے میں جس حرف کا چرچا ہو
دوسرے میں آکر مبہم ہو جاتا ہے

کیسی لَو دیتا ہے ایک چراغِ شام
پھر تاریکی میں مدغم ہو جاتا ہے

خاور اعجاز

ہمیں لگا تھا کہ صرف پانی بدل چکا ہے
مگر وہ دریا تو سب معانی بدل چکا ہے

مِری ہی تمثیل ہے مگر بے وفا زمانہ
لباس، کردار اور کہانی بدل چکا ہے

میں جتنے عرصے میں اس کا کوئی جواز لایا
وہ اُتنے عرصے میں بدگمانی بدل چکا

اب اُس کے لکھے ہوئے پہ کیا اعتبار کرنا
جو سارا اقرار منہ زبانی بدل چکا ہے

زمین اپنی ہی دسترس سے نکل گئی ہے
فلک پہ کوئی کشش پرانی بدل چکا ہے۔

☆☆☆

خاور اعجاز

کہانیاں ہیں تہہِ آب اور کھلی ہے کتاب
نہیں کوئی سرِ تالاب اور کھلی ہے کتاب

زمانہ لاتا ہے خوابِ گزشتہ کی تعبیر
میں دیکھتا ہوں نیا خواب اور کھلی ہے کتاب

وہ داستاں لیے پھرتی ہے چار سو لیکن
وہی ورق ہے وہی باب اور کھلی ہے کتاب

رُکا ہوا ہے فسانہ بھی اور زمانہ بھی
مَیں ایک نکتے میں غرقاب اور کھلی ہے کتاب

جو بند ہے تو مِری آنکھ کا دریچہ ہی
وہ حرف اب بھی ہے بیتاب اور کھلی ہے کتاب

بس ایک مَیں ہی نہیں ان کے درمیاں ورنہ
سجی ہوئی تو ہے محراب اور کھلی ہے کتاب

خاور اعجاز

عمر پونجی لیے میلے سے نہیں جاؤ اَب
شام ہوتی ہے گِرا چاہتا ہے بھاؤ اَب

ہم نفس! مَیں نے بھی پہچان لیا ہے تم کو
مِری تصویر کے پردے سے نکل آؤ اَب

اَن وہ گردابِ تمنا ہے نہ موجِ آزار
کس طرف کو لیے جاتی ہے مری ناؤ اَب

وہ زمانہ بھی تھا ہم زخم چنا کرتے تھے
چوٹ لگ جائے و بھرتا ہی نہیں گھاؤ اَب

خواب تو دیکھ لیے ہم نے بہت سے لیکن
خواب والو کوئی تعبیر بھی دکھلاؤ اَب

☆☆☆

حفیظ شاہدؔ

تم کیوں سمجھ رہے ہو کسی بے نوا کے اشک
پھولوں کی پتیوں پہ ہیں بادِ صبا کے اشک

جھلسے ہوئے گلاب کے پیکر کو دیکھ کر
رُخصت ہوئی ہیں کالی گھٹائیں بہا کے اشک

روئے بغیر بجھ نہ سکے گی یہ دل کی آگ
رکھو گے اپنی آنکھ میں کب تک چھپا کے اشک

آئے تھے دُور سے جو مرے اشک پونچھنے
وہ لوگ تو گئے مرے غم پر بہا کے اشک

دِل سے چلے تھے موجہ خوں کو سمیٹ کر
لیکن پلٹ گئے مری آنکھوں میں آ کے اشک

لوگوں میں رَچ گئی ہے عجب لا تعلقی
اب کون دیکھتا ہے کسی آشنا کے اشک

شاہدؔ نہیں ہے گو یہ پیہم سے کچھ مفر شاید مرے
نصیب میں تھے ، دل لگا کے ، اشک

☆☆☆

حفیظ شاہدؔ

درو و دیوار پر لرزاں ہیں سائے
مرے گھر بار پر لرزاں ہیں سائے

چراغِ گل کی لو مدھم ہے شاید
گل و گلزار پر لرزاں ہیں سائے

مرے افکار کا سورج ہے روشن
ترے افکار پر لرزاں ہیں سائے

لٹی ہے محفلِ اُمید جب سے
دِل بیمار پر لرزاں ہیں سائے

نہ پوچھو سرد بازاری کا عالم
رہِ بازار پر لرزاں ہیں سائے

عجب حالات نے بدلی ہے کروٹ
رُخِ دِلدار پر لرزاں ہیں سائے

گلوں پر رقص ہے کرنوں کا شاید
مگر ہر خار پر لرزاں ہیں سائے

☆☆☆

اوصاف نقوی

وقت کے ہاتھ میں تھی شہنائی
اک ہوا چیختی ہوئی آئی !

ذکر خورشید کا ہوا عنا
اب تو کرنوں کی ہے پذیرائی

سب پہ ہم نے برستے دیکھے ہیں
کون دے پتھروں کو بینائی ؟

ریت جب اُڑ رہی تھی ساحل پر
ایک دریا ہوا تماشائی !

اس کو دیکھا ہے خواب میں جب سے
لَہر سی دِل میں ایک دَر آئی

آج برفاب ہو گیا جذبہ
کل تو عزت ہوئی تھی رسوائی

آنکھ اوصافؔ دیکھ لے خود کو
کاش اپنے سے ہوشناسائی

☆☆☆

اوصاف نقوی

وقت کروٹ بدل نہیں سکتا
صدق میں جھوٹ ڈھل نہیں سکتا

کب ہوا ہوئی فوراً
طِفل یکدم تو چل نہیں سکتا

درد کا اور بھی پڑاؤ ہے
اشک آنکھوں میں پَل نہیں سکتا

ایک شب جو گراں ہوئی دِن پر
ایک موسم ہے ٹل نہیں سکتا

وقت آندھی کے روپ میں آیا
ایک پودا سنبھل نہیں سکتا

مات کھائی ہے ایسی مٹی سے
اَب کے تو ہاتھ مَل نہیں سکتا

میرے اوصاف دھول کی زد میں
میرا جذبہ بدل نہیں سکتا

ڈاکٹر سید جاوید اختر

اک ننھا سا گھر

تمہیں اک خوب صورت ننھے سے
گھر کی تمنا تھی
جسے تم اپنا کہہ سکتیں
سجا سکتیں جہاں کے بان و دَر کو
اپنی مرضی سے
مگر افسوس، عمر مختصر گزری
کرایے کے مکانوں کیں!

زمانہ کج ادا ہے
جیتے جی اک قطعہ ارضی نہیں دیتا
بجز دولت
مگر جب خاک ہو جائیں
تو مرقد کے لیے مل جائے
زمیں ہم کو بنا مانگے

چلو اچھا ہوا
تم چا بسیں ـــــ شہر خموشاں میں
بنا کے، چھوٹا سا اِک گھر
تمنا تو ہوئی پوری
سجا لو اب اسی کے بام و دَر کو
اپنی مرضی سے!

ڈاکٹر سید جاوید اختر

بشارت

اُٹھو کسانو اُٹھو
کہ منظر ہے وطن کی دھرتی
تمہارے ہل کی شجاعتوں کی
لہو کے بیجوں سے مانگ بھر دو
تمام بنجر زمیں کی اب تم
کوال چھو کر قسم یہ کھاؤ
کہ اپنی عظمت کو چھین لو گے
زمیں کے جھوٹے محافظوں سے
تمام بھینسوں تمام بیلوں کے تیز سینگوں
پر ہاتھ کرب ابھی یہ فیصلہ کرو کہ
رسیلی فصلوں کے سبز دریا
چہار جانب بہا ہی دو گے
مجھے خبر ہے
بہار خنداں کا قافلہ لب
وطن کی دہلیز پر آ چکا ہے

اُٹھو اے مزدور پیشہ لوگو، اُٹھو
کہ نیند غفلت کی ہو چکی بس
تمام زندہ حکومتوں نے
تمہاری محنت کا لوہا مانا
وہ ہاتھ جو آج تک حکمراں رہے ہیں
مشین کی بے کراں مملکت کے
اُن ہی سے اب تم اٹھا لو گرزیں
کہ توڑ دو گے
تمام وحشی، درنداع صاف دشمنوں کے سر کو

مجھے تمہارے سفر کی
کڑوی حقیقتوں کا پتا ہے
لیکن تمہاری محنت تمہاری ہمت
تمہاری تقدیس کی قسم ہے مجھ کو
مرے قلم کا مرے جگر کا
لہو جلے گا، چراغ بن کر
تمہارے راستے کی ظلمتوں میں!

تنویر ساغر

نروان

روح، وہ روشن روح جس میں بے کراں صدائے طور
زنگ آلود ، بے ثمر ، شاطرِ قسمتِ انساں کا شعور
دیدگاہوں کے ابرِ معکوس میں
موج در موج حبابِ جاں
طورِ الم کا سماں
وجودِ عدم کا نشاں
المناک ہیں!
کوئی ان کو سجائے تو کیسے؟
دستِ براں کا بوجھ اُٹھائے تو کیسے؟
کثافت زدہ غولِ بیاباں کے گلاب
جو مثلِ دیجور ہیں
مصحفِ زندگی کی نیا بتیں
اپنی وجاہتوں میں
خوابوں کے کم خواب میں بہت دُور ہیں
ان سب کا ایسا عکس
جن کے پرتو سے
چشمِ باطن سے سرابوں کا رسحر کٹ جائے
وحشت زدہ بستیوں کے غم تھم جائیں
اے دلِ ستاں!
آ، کچھ ایسا ہی تخلیق کریں
وہ جس سے
چشم چشم، بے زبانی ایسی کہانی بنے
جس سے لعل و جواہر پھوٹیں

حلقہ حلقہ مصحفِ زندگی
شفاف نظر آئے
مجبور مکینوں کے لئے
گوش در گوش
فرطِ محبت کا سورج طلوع ہو
اے دلِ ستاں!
آ، کچھ ایسا ہی تخلیق کریں
کہ، انسان اپنے دیرینہ، تہہ بہ تہہ روزنِ بادباں سے کھنک اُٹھے
ناداری، بے بسی کے مجسمے میں لہو کا تحرک
سرگرداں ہو جائے
اور وہ لوگ جو
خاموشی کے ایجاب پر
راہِ گرداب پر
وقت سے بے نیاز گامزن ہیں
اپنے ''نروان'' کو پا سکیں
اپنی اماں کو پا سکیں۔
بابِ مقفل کے نشاں کو پا سکیں
اپنے اندر رقصِ طاؤس کی
شرنگیں کہکشاں کو پا سکیں۔